مضامین کرشن چندر

کرشن چندر

مضامین کرشن چندر

اسی مصنّف کے قلم سے

پھول کی تنہائی

اُلٹا درخت

محبت کی رات

ایک گدھے کی سرگذشت

مضامین کرشن چندر

کرشن چندر

مکتبۂ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر سرفراز احمد

مطبع منظور پریس لاہور

انتساب

اس دیوانے کتے کے نام
جس نے متھرا میں مجھے کاٹ کھایا

فہرست

پیش لفظ ، ۹

غلط فہمی ، ۱۱

گانا ، ۱۹

جان پہچان ، ۲۶

غسلیات ، ۳۴

بدصورتی ، ۴۱

رونا ، ۴۷

بیچلر آف آرٹس ، ۵۳

ٹوپ والا ، ۶۲

شادی ، ۶۹

عشق —— اور ایک کار ، ۷۷

میری سلور جوبلی ، ۸۷

الف لیلیٰ کی گیارہویں رات ، ۹۶

آنکھیں ، ۱۰۵

نقد و نظر ، ۱۱۲

میں نے جاپان میں کیا دیکھا ، ۱۲۲

باون ہاتھی ، ۱۳۱

سورج کے پچاس سال ، ۱۳۸

مانگے کی کتابیں ، ۱۵۱

سپردم بتو مایۂ خویش را ، ۱۵۸

پانی کا گلاس ، ۱۶۱

ہوائی قلعے ، ۱۸۳

پیش لفظ

یہ کتاب کرشن چندر کے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ انگریزی ادب میں انشائے لطیف ESSAY کی صنف کو نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اُردو میں خالص ESSAY انشائے لطیف کی طرف بہت کم ادیبوں نے توجہ دی ہے ان ادیبوں میں پطرس بخاری ۔ رشید احمد صدیقی ۔ چراغ حسن حسرت اور کرشن چندر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کرشن چندر کا سب سے پہلا مضمون سنہ ۱۹۳۶ء میں "ہمایوں" میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی افسانے اور مضامین لکھے اور اُردو ادب میں اپنے لیے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند کے بعد شاید ہی کسی اور ادیب کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہو۔ جتنی کہ کرشن چندر حاصل کر چکے ہیں۔ اور ان کے مضامین کی مقبولیت کا بھی یہی عالم ہے جب ان کا پہلا مضمون "ہوائی قلعے" ہمایوں میں شائع ہوا تو ان کے اس مضمون کو مدیر "ہمایوں" نے ان الفاظ میں سراہا۔

کرشن چندر کا شمار اُردو کے موجودہ ادباء کی صفِ اوّل میں ہو سکتا ہے ۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان ۔ سیر حاصل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا زیبِ دست ادیب ثابت

ہو گا —"

کرشن چندر کی متیں اور شیشہ ظرافت کے سبھی نقاد قائل ہیں۔ مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی، طنزیہ اندازِ نگارش۔ اور افسانوی تخیل ان کی تحریر اور اسلوبِ بیان کے خاص لوازم ہیں۔ وہ ایک جدت پسند ادیب اور مفکر ہیں جو کچھ لکھتے ہیں اسے دل کی گہرائیوں سے سوچتے ہیں اور پُرخلوص لہجے میں اُسے بیان کرتے ہیں۔ ان مضامین میں جہاں آپ کو انشائے لطیف کے نہایت نفیس نمونے ملیں گے۔ وہاں آپ ان کی افسانوی دلکشی سے بھی محفوظ ہوں گے۔

کرشن چندر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسمِ خیال" ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "نظارے" ۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبی دُنیا نے شائع کیا۔ "یہ کتاب" ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔

غلط فہمی

جن لوگوں کے متعلق عوام غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی ہوں۔ کہنے کو تو میں ایک گھٹیا سے کالج میں ذلیل قسم کا پروفیسر ہوں۔ پچھتر روپیہ تنخواہ ملتی ہے اور سارا دن ایف۔ اے کے لڑکوں کی انگریزی املا درست کرتے ہیں گزرتا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ میرے گاؤں کے لوگ، میرے معمولی واقف کار اور چند وہ پرانے احباب جو کبھی ایف۔ اے یا بی۔ اے میں ہم جماعت تھے۔ اور اب کسی دور افتادہ شہر میں کسی پرائیویٹ فرم میں کلرکی کی آسامی پر سڑ رہے ہیں۔ مجھے کسی فلم کے ہیرو سے کم نہیں سمجھتے۔ اگر گاؤں والوں میں سے کسی کی پیشی لاہور کی کسی کچہری میں پڑ جائے تو وہ کم بخت وہیں گاؤں والوں میں سے میرا لاہور کا پتہ پوچھتا ہے اور پھر نہایت فخر سے تانگے والے کو کہتا ہے۔ چل نمبر ۴۴ چنگڑ محلہ پروفیسر صاحب کی کوٹھی جانا ہے گویا سارے لاہور میں ایک میں ہی پروفیسر رہ گیا ہوں۔ اور وہ جو گنجے سروں والے پانچ

سو روپیہ پاتے ہیں۔ بعض جھک مارتے ہیں اور برے پھر رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کم از کم میری آدھی تنخواہ انہی بن بلائے مہمانوں کی خاطر تواضع میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جس کا صلہ مجھے صرف اتنا ملتا ہے کہ واپس گاؤں جا کر میرے متعلق شیخیاں بگھاری جاتی ہیں۔" میں وہاں لاہور پیشی تھی۔ گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے گھر پر ٹھیرا تھا۔ انہوں نے میری بہت بہت خاطر کی۔ دو دن ہلنے نہ دیا۔ بہت سعادت مند ہے۔ غرور نام کو نہیں چھو گیا۔"

گو میری تنخواہ صرف پچھتر روپیہ ہے۔ مگر سوائے چند ایک دیرینہ احباب کے ہر شخص کو میری تنخواہ کے متعلق بھی غلط فہمی ہے۔ وہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا اللہ کرے کم از کم دو ڈھائی سو تنخواہ پاتا ہوں۔ اس کا تذکرہ نہایت حاسدانہ لہجہ میں کیا جاتا ہے۔ جسے سننے میں گو مجھے کوفت بھی ہوتی ہے۔ تو ایک قسم کی مسرت بھی۔ مثال کے طور پر بازار میں چلتے چلتے کوئی پرانے ہم جماعت مل گئے۔ اچھی طرح سے مصافحہ ہوا اس کے بعد "یار، سنا ہے کہ تم پروفیسر ہو گئے ہو۔ سنا ہے؟ گویا یقین نہیں آتا، یار سن کر بہت مسرت ہوئی (پروفیسر میں بنا اور مسرت ان کو ہوئی) یار، خوب عیش کرتے ہو نا (یعنی خدا تمہیں غارت کرے!) اور ڈھائی سو روپیہ تنخواہ پاتے ہو۔ ذرا میری طرف دیکھو۔ لدھیانہ میں کھڈ ہر کمپنی میں بتیس روپے تنخواہ لیتا ہوں۔ ایک بیوی ہے اور دو بچے۔ جان ضیق میں ہے" "تم تو عیش کرتے ہو یار" دو ڈھائی سو روپے تنخواہ" غرضیکہ احباب "دو ڈھائی سو روپوں" کا ذکر اس دلی خلوص اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ اکثر مجھے بھی اطمینان سا ہو جاتا ہے۔ اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ واقعی میری تنخواہ اتنی ہی ہے۔ مگر جب مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔ تو یہ دلفریب سراب پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے میری علمی قابلیت کے متعلق مختلف نظریئے قائم کر رکھے ہیں۔ اور میری ہزار کوششوں پر بھی وہ ان نظریوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ گاؤں والے خصوصاً تو یہ سمجھ چکے ہیں۔ کہ دُنیا بھر کے علوم و فنون جانتا ہوں۔ اگر کسی نے اپریشن کرانا ہو۔ اگر کسی کا مقدمہ ہو۔ کسی کو دمے کی بیماری ہو۔ کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو۔ وہ فوراً لاہور آکر مجھ سے صلاح طلب کرتا ہے۔ اور مجھے چارو ناچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ اوّل تو سچ سننے کو کوئی تیار نہیں۔ اور پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر لوگ آپ پر خواہ مخواہ ایمان لے آئیں تو موسیٰ بننے میں کونسی وقت رہ جاتی ہے اور پھر میں تو کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا عدم تشدد کے فلسفے، لورڈ ٹنگ کی ردیوں اور غلط املا سے بھری ہوئی کاپیوں نے مجھے بے حد نرم دل بنا دیا ہے۔

بعض افراد کے نزدیک میرا پروفیسر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ میں لاہور کے سب بڑے بڑے حاکموں، نوابوں، رئیسوں اور یونیورسٹی کے ممتحنوں کو جانتا ہوں۔ کوئی چاہتا ہے کہ میں ڈپٹی کمشنر سے اس کی ملاقات کرا دوں کوئی کسی بیمہ کمپنی میں نوکری کا متلاشی ہے۔ کوئی نواب جھنگڑ خاں کی کوٹھی کو تعمیر کرنے کا ٹھیکہ مانگتا ہے اور مجھے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک سے ہاں کہہ دیتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تو بلا ٹل جاتی ہے۔ بعد میں بہت باتیں گھڑنا پڑتی ہیں۔ مگر بعد میں یہی غنیمت ہے۔

ابھی اس دن کا واقعہ ہے۔ میرے دوست شبیر علی خاں بلوچ تشریف لائے۔ شاید تیسری جماعت میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ پھر میں لاہور آگیا۔ اب اتنے سالوں بعد آج ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے "آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں شبیر علی خاں بلوچ ہوں۔ میں آپکے ساتھ تیسری جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ یاد آیا؟"

خوب یاد آیا۔ یہ وہی صاحب تھے۔ جو اکثر میرے پیسے چھین لیا کرتے تھے۔ میری جیب سے ریوڑیاں نکال کر کھا جایا کرتے تھے۔ مذاق مذاق میں مجھے سکول کے باہر گندی نالی میں گرا دیا کرتے تھے۔

او ہو۔" آپ ہی شیر علی خاں ہیں"۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔" کہیئے مزاج کیسے ہیں۔ سوڈا وڈا منگواؤں؟"

سوڈا وغیرہ تو بعد میں پی لوں گا۔ شیر علی خاں نے کہا۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ یہاں پروفیسری کرتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ میں آج کل نارمل کا امتحان دے رہا ہوں جغرافیہ کا پرچہ بہت بڑا ہوا ہے۔ پاس ہونے کی مطلق اُمید نہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کے پاس چلوں۔ آپ خاں بہادر رحیم۔ کو تو جانتے ہوں گے۔ اگر مل ملا کے کام ہو جائے ——————"

میں نے دل میں سوچا۔ کہاں خان بہادر رحیم ——— اور کہاں میں، نہ ہی تو میں ان کو جانتا ہوں۔ اور نہ ہی ملنے ملانے سے یہ کام ہو سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ میں ذرا بزدل واقع ہوا ہوں۔ اس لئے میں نے جھٹ کہہ دیا۔" یہ تو معمولی سی بات ہے خان بہادر رحیم ——— کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ابھی کل ہی میرے ہاں چائے پینے آئے تھے۔ اگر آپ اُس وقت آ جاتے۔ خیر کوئی بات نہیں"۔

خدایا تیرا ہزار ہزار شکر۔ شیر علی خاں بلوچ نے گرج کر کہا۔" آپ پھر ان کو ملیں گے نا۔ میرا رول نمبر لکھ لیجئے۔ نمبر ۳۶ ہے ۳۶ بھولئے گا نہیں"۔

کبھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ۳۶ نمبر مجھے اچھی طرح یاد رہے گا۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کل ہی خان بہادر کو کہہ دوں گا۔

اچھا تو میں چلتا ہوں۔

واہ صاحب۔ آئے بھی اور چل بھی دیئے۔ ایک دو دن تو ٹھہریئے۔ ضرور ٹھہرتا۔ ضرور ٹھہرتا۔ شبیر علی خاں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مگر کل دوسرا پرچہ ہے پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

شبیر علی خاں چلے گئے۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ کم از کم میرے ذہن سے تو یہ واقعہ بالکل اُتر گیا۔ لیکن ایک روز کیا ہوا۔ کہ عین رات کے گیارہ بجے کسی نے زور سے دروازہ کھڑکھڑایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا شبیر علی خاں تھا۔ آیئے آیئے۔ میں نے بناوٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

شبیر علی خاں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ میں اسی بات کے لئے حاضر ہوا ہوں کہئے کچھ بنا؟

سب کام ٹھیک ہوگیا۔ آپ تسلی رکھیں۔ میں نے اسی دم جھوٹ موٹ کہا۔

کیا اُنہوں نے مجھ کو پاس کر دیا۔

ہاں ہاں۔ میں خان بہادر کے پاس گیا تھا۔ وہ کہنے لگے۔ آؤ یار مدت کے بعد آئے ہو۔ میں نے کہا ایک لڑکے کو پاس کر دیجئے۔ چنانچہ اُنہوں نے بیس نمبر اور دے دیئے۔ اندر تشریف لایئے نا۔ میں نے شبیر علی خان سے کہا۔

میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ شبیر علی خاں نے کہا۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھول سکتا۔

کس کا احسان دوست! میں نے انکساری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ یہ تو ایک بالکل معمولی سی بات تھی۔

ہاں تو مگر آپ کو ٹھیک پتہ ہے نا۔ شیر علی خاں نے کہا بیس نمبر دیئے تھے۔

ہاں ہاں پورے بیس۔

میرا رول نمبر تو آپ کو یاد تھا؟ بھلا کیا تھا؟ شبیر علی خان نے کہا۔

یہی نمبر ـــــــ نمبر ـــــــ۔ دکمبخت یاد نہیں آتا یہی نمبر ۳۷ تھا۔

نمبر ۳۷ شبیر علی خاں بلوچ نے صحیح کر کہا۔ میرا نمبر تو ۳۶ تھا۔

ہاں نمبر ۳۶ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اف کتنی غلطی ہوئی۔ میں نے ۳۶ کو ۳۷ سمجھ لیا۔

شبیر علی خاں بولے۔ میں نے آپ کو اسی وقت کہا تھا۔ کہ آپ میرا رول نمبر لکھ لیں۔ مگر آپ نے نہ لکھا۔ نمبر ۳۷ والا پہلے ہی بہت لائق لڑکا ہے۔

اوہو ٹھیک یاد آیا۔ میں نے جلدی سے جواب دیا کتنی بھول ہوئی۔ تبھی تو خاں بہادر کہتے تھے۔ اس لڑکے کو پہلے ہی بہت نمبر ملے ہیں۔ تم اُسے بیس نمبر اور کس لئے دینا چاہتے ہو۔ کیا اسے یونیورسٹی میں اول کرانا چاہتے ہو۔ تو میں نے کہا تھا بہادر صاحب آپ اُسے میری خاطر بیس نمبر اور دے دیجیئے۔ اف اب خیال آتا ہے نمبر ۳۷ تھا کتنی غلطی ہوئی۔

پھر؟ شبیر علی خان نے پوچھا

آپ مطلق فکر نہ کریں۔ میں نے اُسے تسلّی دے کر کہا۔ کل ہی خان بہادر کے ہاں جاکر اُنہیں حقیقت سے واضح کردونگا۔ اور اس لڑکے کے بیس نمبر کاٹ کر آپ کو دے دیئے جائیں گے۔"

شبیر علی خان چلا گیا۔ اور میں پھر اس واقعہ کو بھول گیا۔ ایک مہینہ کے بعد اچانک

مجھے شبیر علی خاں کا خط آیا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔ اور اس نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔

شبیر علی خاں کے اس واقعہ کے بعد لوگوں کو پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ یونیورسٹی میری زر خرید غلام ہے۔ جو چاہوں کر سکتا ہے چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماموں مجھے ملنے کے لئے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ امسال عزیز پرکاش چند نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ انگریزی اور حساب کے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ یوں تو جماعت میں خاصا لائق سمجھا جاتا ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے۔ کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اس کا ذرا خیال رکھنا۔ اور ممتحنوں سے مل کر ——————

میں نے سر ہلا کر کہا۔ اوہ بالکل فکر نہ کریں۔ پرکاش ضرور پاس ہو جائے گا۔
اس کے بعد ماموں جان کے کئی خط آئے۔ اور ہر خط میں یہ فقرہ ہوتا تھا "میں نے وہ بات جو آپ کو لاہور کہی تھی۔ اس کا دھیان رکھنا" اور کبھی کبھی مامی جان بھی لکھ بھیجتی تھیں پرکاش کا خیال رکھنا۔ پرکاش گویا تمہارا اپنا چھوٹا بھائی ہے اگر تم نے اس کو پاس نہ کرایا تو میں ساری عمر تم سے نہ بولوں گی"۔ وغیرہ وغیرہ۔
کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پرکاش چند پاس ہو گیا۔ بس اب میرے ماموں سب کو سناتے پھرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے پاس کرایا ہے۔ آخر اپنے عزیزوں کو اتنا بھی فائدہ نہ ہو تو اور کیا ہو گا۔ اور ادھر جب پرکاش چند ایف۔ اے۔ میں داخل ہونے کے لئے آیا۔

تو میں نے تہدید کے انداز میں اس سے پوچھا۔ کیوں بے پرکاش یہ تو ہسٹری کے پرچے میں کیا اوٹ پٹانگ لکھ آیا تھا۔ اکبر کی جگہ اشوک اور وارن ہیسٹنگز کی جگہ لارڈ ڈلہوزی کا عہدِ حکومت کیوں لکھ دیا۔ پھر انگریزی کے پرچے میں تو نے ایسے اتنے غلط

کیوں بھئے۔ عزیز کام کرنا سیکھو۔ ورنہ ہر سال تو میں پاس کراتے سے رہا۔
اور بیچارے پرکاش چند نے سر جھکا کر کہا۔ جی غلطیاں کیا بتاؤں ہو ہی گئیں۔ مگر لڑکے ہر بار پاس نہیں ہوتے۔ تو میرے پاس اس کے لئے بھی گھڑے گھڑائے جواب موجود ہیں۔

اجی آپ کا لڑکا کیا پاس ہوتا۔ آپنے تو اُلٹا مجھی کو شرمندہ کرایا۔ میں لالہ ایشری پرشاد کے پاس گیا۔ تو انہوں نے فوراً سب پرچے میرے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا تم خود ہی انصاف سے جتنے نمبر چاہو دے دو۔ اب میں کیا کرتا۔ کچھ لکھا ہوتا۔ تو نمبر دیتا جو جواب دیکھو غلط۔ املا غلط، ہجے، معانی غلط، سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لونڈا سارا سال کیا کرتا رہا ہے۔

کرتا کیا رہا ہے؟ لڑکے کا باپ چھڑی ہاتھ میں لے کر جواب دیتا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ سارا سال تاش کھیلتا رہا ہے۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ یہ پاس کیسے ہوتا کیوں بے حرامی۔

اب اسی طرح سے کئی لڑکوں کو پڑھا چکا ہوں۔ پھر بھی لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے میں نے تنگ آکر پروفیسری چھوڑ دی ہے۔ اب میں انارکلی میں آٹے، تیل، لون کی دکان کرتا ہوں۔ مگر اس پر بھی لوگوں کی غلط فہمی دُور نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی تک پروفیسر ہوں اور اس دکان پر یونہی چلا آتا ہوں۔ یا شاید یہ میرے کسی دوست کی دوکان ہے اگر میں کسی کو سچی بات بتا بھی دوں۔ تو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اس لئے خوب کھکھلا کر ہنستے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہا ہا! پروفیسر صاحب آپ تو نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔

اِس دنیا میں سچائی جھوٹ ہے اور جھوٹ سچائی

گانا

گانا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم تو وہ ہے جو متوسط درجے کے گھروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے، دیکھی جاتی ہے، اور ہاں، اگر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو سُنی بھی جاتی ہے، عام طور پر ایک گھٹیا سا رذیل ہارمونیم ہوتا ہے، یوں تو موسیقی کے اعتبار سے ہر ہارمونیم ہی فطرتاً رذیل ہوتا ہے، لیکن پھر اس رذالت کے بھی کئی درجے ہیں اور متوسط گھروں میں اکثر باجے درجہ سوم اور چہارم کے ہوتے ہیں۔ مگر خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی، اصلی چیز تو "گانا" ہے، گانے کے لئے متوسط درجے کے گھر میں ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے، بہت سے گھروں میں شاید ایک سے زیادہ ہوتی ہونگی، لیکن اوسط کے اعتبار سے ایک ہی کافی ہے آپ اس لڑکی کو جو چاہے کہہ کر پکاریئے، بملا، کملا، زبیدہ، پرکاش کور، مطلب ایک ہی ہے یعنی اوسط گھرانے کی لڑکی جو گانا جانتی ہے اور جس پر سارے "گھر والوں" کو ناز ہے۔ اب اس لڑکی کو آپ ذہن میں رکھئے اور پھر اُس ہارمونیم کی طرف بھی خیال کیجئے جو اس طاقچے میں لکڑی کے صندوق میں جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا ہے۔ نہایت احتیاط سے

رکھا ہوا ہے۔

متوسط درجے کے گھروں میں گانا عموماً کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور اس کا محرک بیچارا وہ غریب مہمان ہوتا ہے۔ جو بھولا بھٹکا کبھی متوسط درجے کے گھر میں آنکلتا ہے، پیٹ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اور چند لمبی لمبی کھٹّی ڈکاریں لیکر میزبان مہمان سے پوچھتا ہے۔

"تاش واش کھیلو گے؟"

"نہیں"

"ایک آدھ بازی برج کی؟"

مہمان ایک جمائی لے کر جواب دیتا ہے "جب سے سکہ ٹریٹ میں ملازم ہوا ہوں، برج بھی بھلا بیٹھا ہوں"

"اچھا تو پھر ——— جا مُنّے، گراموفون اُٹھا لا"

جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت و مشقّت میں نہیں، نہ اس امر میں کہ اُنہوں نے مغربی تہذیب و سائنس کو اپنایا ہے، بلکہ محض اس امر میں ہے کہ وہ لوگ ہندوستان کے متوسط طبقے کو جاپانی گراموفون، جاپانی سائیکل، جاپانی گھڑیاں، جاپانی تصویریں اور اسی قسم کی ہزاروں سستی اور بیکار چیزیں بھجکر اُسے ہمیشہ فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ سیاسی غلامی اور ذہنی غلامی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر اس گراموفون کو لیجئے، دیکھنے میں سبک، خوشنما، بالکل ریڈیو معلوم ہوتا ہے قیمت صرف پچیس روپے دسویں بارھویں دن اس کا Funnel ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ ایک بالکل فروعی بات ہے، اصل بات تو ہے گانا! یہ ناچ آپنے

سنا، پتلی کمر توری بل کھائے جائے"۔۔۔۔ "جی میں نے فلم دیکھا تھا"۔ "اوہ ۔۔۔ اچھا یہ ریکارڈ! اک میرے ماہی دی مندری ۔۔۔۔ بابو ۔ یہ آپ نے نہیں سنا ہوگا۔"

"اچھا سنا دیجئے"۔

ریکارڈ بجنا شروع ہوتا ہے۔ آدھا ریکارڈ ختم ہونے کے بعد فنر ٹوٹ جاتا ہے، یا یونہی گھرڑ، گھرڑ، گھرڑ کی آوازیں سنائی دینے لگ جاتی ہیں۔

میزبان بُرا سا مُنہ بنا کر کہتا ہے، ارے منّے ۔۔۔۔ گراموفون بند کر دو (اور پھر مسکرا کر) بملا! (یا کملا یا زبیدہ یا یہ کاش کور) انہیں گانا سناؤ بیٹی!

بملا آخر متوسط گھرانے کی لڑکی ہے، حیا سے کانوں تک سرخ سرخ ہو جاتی ہے، اور سر جھکا لیتی ہے، اس طرح کہ بیچارے مہمان کو پورا یقین ہو جائے، بیچاری بملا گانا تو کجا بولنا بھی نہیں جانتی۔

میزبان دوسری بار پھر پیار سے مگر ذرا اونچی آواز میں کہتا ہے، بملا، جا ہارمونیم لے آنا، وہ اُس طاقچے میں دھرا ہے۔"

اور مہمان جس کی پلکیں نیند سے جھکی جا رہی ہیں آہستہ سے ہمت بڑھانے کو کہہ دیتا ہے، ہاں بہن بملا! کچھ سنا دو۔ سنا ہے تم بہت اچھا گاتی ہو (پھر جلدی سے یہ فقرہ جڑ دیتا ہے)، رام بھروسے کی ماں سے سنا تھا۔

اب یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، نہ بیچاری بملا اچھی طرح گا سکتی ہے اور نہ رام بھروسے کی ماں گانا سُن سکتی ہے کیونکہ وہ بیچاری تو بہری ہے، اور پھر "بہن بملا"! اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستان ہے جہاں عورتوں کی صرف دو قسمیں ہیں، ایک قسم ماں، دوسری بہن، اگر خوبصورت ہو۔ جوان ہو تو بہن اور اگر بدصورت، ادھیڑ، بوڑھی ہو تو اماں، بس اور تیسری قسم

کوئی نہیں۔ کیونکہ جب عورت کی شادی ہو جائے تو پھر وہ عورت نہیں رہتی، بلکہ پاؤں کی جوتی بن جاتی ہے۔

اب بملا گاتی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے، اماں مونڈھے پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں لیئے لڑکی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کہ کہیں بملا نگاہ اُٹھا کر مہمان کی طرف دیکھ تو نہیں رہی! . . . مدھم بار یک آواز میں بملا گا رہی ہے، ہارمونیم الگ اپنے سروں کو بجا رہا ہے۔

گلا . . . ہاں گلا . . . کاٹ لو . . . گلبدن دھیرے دھیرے

دھیرے دھیرے . . . . .

مہمان گانا سنتے سنتے تصوّر کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ قصاب تیز چھری گردن پر رکھے بیٹھا ہے اور نیچے بکری ممیا ممیا کر کہتی ہے "گلا . . . ہاں گلا، . . . کاٹ لو گلبدن! دھیرے . . . دھیرے" ایک قصاب کے لئے "گلبدن" کی تشبیہ کتنی نازک اور پیاری ہے، یہ شاعر لوگ بھی عجب دماغ رکھتے ہیں، مہمان ابھی یہاں تک ہی سوچ سکتا ہے کہ بملا دوسرا گانا شروع کر دیتی ہے۔ ایک نئی لَے ہے، مدھم اور غمگین۔

تم میرے . . . . تم میرے . . . . . . میں تیری

اُوں . . . . اُوں . . . . اُوں

تم میرے . . . . تم میرے . . . . . . میں تیری

اُوں . . . . . اُوں . . . . اُوں

اور بیچارا مہمان حیران ہو کر سوچتا ہے کہ اس اُوں اُوں کا کیا مطلب، مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا، آخر جرأت کر کے پوچھ لیتا ہے اور . . . بہن بملا! اس دوسرے بند کا کیا مطلب؟

اور بہن بملا لجا کر کہتی ہے، جی، مَیں نے فلم میں ایسے ہی سُنا تھا۔

متوسط طبقے سے اُوپر گانا اپنی ہئیت یکسر بدل لیتا ہے، اس کی تمام جزئیات تبدیل ہو جاتی ہیں، ہارمونیم کی جگہ گنبد کی طرح گونجتا ہُوا ارگن، "یہ ہیں نے بارہ سو روپے میں خریدا تھا، کچھ اتنا بُرا بھی تو نہیں"۔ شرمیلی بملا کی جگہ ایک شوخ و شنگ، تتلی، رنگین ہونٹ، بیباک نگاہیں، "آپ کیا سُننا پسند کریں گے؟ بلُو ڈینیوب، یا گریس مور کا نغمہ اچھا؟ آپ مغربی موسیقی کو پسند نہیں کرتے۔ مگر سہگل تو کب کا پرانا ہو چکا . . . ."
ارگن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے . . . "اُس دن آیا، کماری جو تھیکار ائے کا ایک ریکارڈ لے آئیں، یونہی پسند آگیا۔ جیسے ریڈیو پر کبھی کبھی کوئی چیز آہی جاتی ہے"، انگلیاں پھیرتے پھیرتے گانا شروع کر دیتی ہیں، اور گانے کے دوران میں بار بار دیکھتی جاتی ہیں، آپ کی طرف، آپ مُسکرا مُسکرا کر داد دیتے ہیں۔ اور گانا ختم ہونے پر تالی بجاتے ہیں (Encore) "آپ کس سے گانا سیکھتی ہیں؟" "ربّے خاں لکھنوی" "وہ تو بڑے اُستاد ہیں اپنے فن کے" "ہاں اڑھائی سو سے کم نہیں لیتے، پاپا کہتے ہیں گانا سیکھنا ہو تو کسی لکھنوی استاد سے سیکھا جائے۔ ناچ بھی وہی سکھاتے ہیں!"

دراصل متوسط درجے سے اوپر گانا کم اور ناچ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اور پھر گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، اس کا نام ہے "کلاسیکل میوزک" عجیب شے ہوتی ہے یہ بھی، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا ہے، شاید اسی لئے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، خاص کر وہ گروہ جو اپنے آپ کو ادب اور آرٹ کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے، کلاسیکل میوزک کے سوا اور کسی شے کو پسند نہیں کرتا۔ کوئی "چیز" سنائیے، "یہ چیز" دوسرا نام ہے کلاسیکل میوزک کا، "چیز" میں آکر گانا اپنی معراج کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کوئی "چیز" سُننے پر اس قدر

مصر رہتا ہے۔ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کلاسیکل میوزک کا ماہر ثابت کرے۔" اُس دن ہم نے وائی، ایم، سی، اے میں جی دسوارا اور جانگٹی کا گانا سُنا۔ کیا دُھر پد الاپا ہے، بھاگ اور سُورٹھ، جی، مالکونس اور زنلنگ، واہ، واہ، یا پھر اُس دن لطف آیا تھا جو ہم نے پیارو قوال کو نواب صاحب کو دعوت دینے کے موقع پر اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ واہ، واہ، بیٹھے نے کیا کیا تانیں اڑائی تھیں، کیا کیا "کلیان،" بنائی تھیں۔ بھیم اور جوگ، بھیروی اور درباری اور مانڈ۔۔۔ بس مانڈ تو پیارو قوال پر ختم ہے!"

میرا اپنا تجربہ ہے کہ کلاسیکل میوزک کا ماہر بننے کے لئے کچھ زیادہ وقت پیش نہیں آتی۔ آٹھ دس راگ راگنیوں کے نام یاد ہوں، چیز، کلی، تان، پھیرن، بلٹا اور اس قسم کے آٹھ دس فنّی نام یاد کر لئے جائیں۔ طبلہ کی تھاپ پر کبھی کبھی سر ہلا دیا جائے، لوگ کہیں دیکھئے تو صاحب بھیم کی گت کیا خوب بجاتے ہیں، آپ کہیں، نہیں صاحب، ہم طبلے والے کی تھاپ پر مرے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مجلس میں لوگ آپ کو کلاسیکل میوزک کا استاد سمجھنے لگ جائیں گے، ہر ایک گویا آپ کی طرف ہی بازو ہلا ہلا کر گائے گا۔ "تانی دھانی یا ہا گا دھا، تانی دھا، تانی دھا!" اور آپ سر ہلا کر کہیں گے، بھئی، واہ، واہ، واہ! چیز کس خوبی سے اُٹھائی ہے، بس اب "اُلٹ کلیان،" سُنا دو تو روح خوش ہو جائے۔

سیانوں سے سُنا تھا کہ گانا رُوح کی غذا ہے، لیکن ان تین قسموں میں کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو رُوح کو بالیدگی بخش سکے، یہ سب نام و نمود کے دھندے ہیں، ان تینوں طبقوں کے لوگ گانا سنتے ہیں تاکہ موجودہ تہذیب کے ظاہری لوازم کو پورا کر سکیں، اس کے پسِ پردہ ڈر ہر وقت موجود رہتا ہے، مبادا کوئی اُنہیں جاہل، ادب اور آرٹ سے بیگانہ سمجھے، اسی لئے تو موٹی توند والا رئیس اور بڑی مونچھوں والا نواب اور باتیں بنانے

والا پروفیسر اور سکرٹریٹ کی میز پر سر جھکا کر لکھنے والا کلرک، ہر ایک اپنے آپ کو گانے کا شیدائی جتاتا ہے ـــــ لیکن گانے کی ایک اور قسم بھی ہے، چوتھی، آخری اور سب سے نچلی، یہاں نہ ہارمونیم ہوتا ہے، نہ ستار نہ وائلن نہ ارگن، یہاں نہ کلیاں بنائی جاتی ہیں، نہ پلٹے اٹھائے جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی ڈھولک ہوتی ہے، اور پچاس ساٹھ مزدور اور ان کی عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں، اور ننگ دھڑنگ بچے، تالیاں بجاتے پاؤں ہلاتے "بجریا توری پہ بلہار، بجریا توری" ملی جلی آواز میں، موٹی، پتلی، لمبی، کوئی گاتے گاتے کھانسنے لگ جاتا ہے، کوئی گاتے گاتے ہنستے لگ جاتا ہے، درمیان میں ڈھولک بجتی ہے، کوئی پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر جھنجھنا رہا ہے۔ تو کوئی کانسی کے کٹورے میں پیسہ رکھ کر بجا رہا ہے کھلا سا گندہ صحن ہے، آسمان پر ستارے اُن گھنگھرؤں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، جو کسی مست رقاصہ کے ٹخنوں سے اتر کر ادھر اُدھر فرش پر بکھر گئے ہوں، اُن کے درمیان میں چاند ہے، جو کانسی کے کٹورے کی طرح چمک رہا ہے۔ گاتے ہوئے مزدور، چمکتا ہوا چاند، بے ہنگم لیکن پُر مسرت نغمہ دل کو خوش کرنے والا، دن بھر کی تھکن اُتار دینے والا، سیانوں نے سچ کہا تھا، گانا روح کی غذا ہے! ـــــ لیکن کئی لوگوں کے پاس رُوح نہیں ہوتی، وہ صرف ایک خول رکھتے ہیں۔

جان پہچان

اجنبیوں اور دشمنوں کو چھوڑ کر آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ہوتے ہیں دوست، یعنی محض دوست، اوّل اور آخر دوست، بے تکلف، بے شرم، بے حیا، ایسے آدمیوں سے جی ہمیشہ خوش رہتا ہے، کیونکہ آخر ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں اور پھر ساری عمر اُن کے ساتھ ہی نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اپنے دوستوں میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آتی۔

دوسری قسم کے آدمی وہ ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں Acouaintanec اور اردو کی عام اصطلاح میں "جان پہچان کے لوگ کہا جاتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ان جان پہچان کے لوگوں سے انتہائی نفرت ہے۔ میں بقول یسوع مسیح اپنے دشمن سے محبت کر سکتا ہوں، مگر ان جان پہچان کے لوگوں سے خوش کلامی سے پیش آنا میرے لئے ایک نہایت دشوار امر ہو گیا ہے، گویہ لوگ آپ کو کبھی کبھار ملتے ہیں۔ مگر جب ملتے ہیں تو اتنا زچ کرتے ہیں۔ کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ پر زور

سے ایک چانٹا رسید کر کے کہا جائے، "آداب عرض، بندہ اب چلتا ہے۔ امید ہے پھر کبھی ملاقات ہو گی"۔ کچھ تھوڑی سی بد تہذیبی تو ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ بد تہذیبی دوستوں میں جائز ہے تو جان پہچان کے لوگوں میں کیوں نہ روا رکھی جائے۔

مثال کے طور پر اُس روز کے واقعے کو لیجئے۔ میں انار کلی میں ایک دوکان کے باہر کرسی پر بیٹھا کباب کھا رہا تھا۔ کہ جس طرح شریف ہندوستانیوں کا پرانا دستور ہے، اور گو کبھی کبھی بازار میں سے تیز تیز موٹروں کے گزر جانے سے حلق میں تھوڑی سی اڑتی ہوئی مٹی بھی پہنچ جاتی تھی۔ مگر اس کا کیا ہے اگر ہم اپنی پرانی وضعداری نہ نبھائیں گے تو اور کون نبھائیگا۔ انگریزوں کو دیکھئے کیا اُنہوں نے بھی گرمیوں میں ہماری ڈھیلی ڈھالی شلوار، دھوتیاں اور لمبے لمبے پتلے پتلے ململ کے کرتے پہنے ہیں؟ اگر نہیں تو ہم کیوں بازار میں بیٹھ کر کباب اور چانپیں نہ کھائیں؟ کیوں؟

معاف کرنا، مجھے کیا کہنا تھا اور کیا کہہ گیا، دراصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت میں غصّہ بہت ہے، کچھ تو کباب سرد تھے پھر بازار میں اُڑتی ہوئی گرد اور میں ابھی پوری طرح اپنی قسمت پر غور و خوض بھی نہ کرتے پایا تھا کہ مسٹر روی دت آن دھمکے وہ سامنے سے دانت نکالے چلے آ رہے تھے۔ اور میں کباب کھا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو بھاگ نہ سکا اور انہوں نے آ کر مجھے شانوں سے پکڑ لیا۔ اور مجھے اچھی طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے بولے "ہیلو! ہیلو"۔

اس کے بعد پھر آپ ہی ہنسنے لگے ہی، ہی، ہی۔

اب بھلا یہ ہنسی کس بات پر تھی۔ میں نے کہا اچھے تو ہیں آپ یعنی میرا مطلب یہ

تھا۔ خدا اگر تمہیں غارت کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا یہ ان جان پہچان کے لوگوں کی ایک بہت بڑی نفسیاتی خصوصیت یہ ہے کہ جب ملتے ہیں۔ تو نہایت تپاک سے اور اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اگر تم ان کے سگے بھائی نہیں ہو تو بھلا چچازاد بھائی سے کیا کم ہو گے۔ اتنی خوشی، اتنی دلی مسرت، اتنی اُلفت کا اظہار کرتے ہیں کہ تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اگر یہ کمبخت آج مر گیا تو کم از کم آدھی جائداد ضرور ہمارے نام لکھ جائے گا۔

چنانچہ میں نے روی دت کو کہا ” کباب کھایئے “

نو ـــــ نو ـــــ تھینک یو ـــــ تھینک یو ـــــ

یہ کہہ کر آپ ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئے اور کباب اڑانے شروع کر دیئے۔ کباب کھاتے کھاتے بھکنے لگے، یار تمہیں مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے کتنی مسرّت، ارے یار کیا بتاؤں، کتنی مدت کے بعد ملے ہو۔ میاں تین کباب اور دینا، گرما گرم، ہوں۔

بار ؛ مجھے اپنے دل میں انتہائی ندامت محسوس ہوئی، یہ بیوقوف کا بچہ، پروفیسر دل کا ٹوڈی۔ مجھے اپنا دوست کہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بی۔ اے میں میرا ہم جماعت تھا اور بس۔ نہ سلام، نہ دعا۔ میں صرف اس کی شکل ہی سے اسے پہچانتا تھا۔ ورنہ بی۔ اے میں تو میں نے کبھی ان ٹپ دق کے مریضوں سے واسطہ نہیں رکھا۔ کاش نہ میں سڑک پر بیٹھ کر کباب کھاتا نہ اس حالت کو پہنچتا۔

” دو کباب اور دینا “ ـــــ روی دت نے کہا، یار کیا بتاؤں تمہیں مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، بھلا کے سال ہو گئے ہیں تمہیں ملے ہوئے، تین کہ چار،

میں نے دل میں کہا اے خدا، یا تو یہ، اے میں اس کی شکل تو نے دکھائی تھی یا آج پھر تو یہ منحوس صورت میرے سامنے لایا ہے۔ تیرے بھید کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے روی دت سے مسکرا کر کہا "غالباً چار سال، بی۔اے پاس کرتے کے بعد"

"ہاں ٹھیک یاد آیا، چار، پورے چار"، روی دت نے جواب دیا "چار ——— چار کباب دینا ذرا گرم ہوں"

یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے، ورنہ نہ کام اور جان پہچان کے لوگ ہی تو وہ بیماریاں ہیں جن کا حکمی علاج آج تک کسی ڈاکٹر یا حکیم نے معلوم نہیں کیا۔ اس موقعہ پر مجھے بکرم سنگھ یاد آتا ہے۔ کمبخت امجد نے ایک دفعہ غلطی سے میرا اور اس کا تعارف کرا دیا تھا۔ اب اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک ہی شہر میں رہنے کا بہت بڑا نقص یہ ہے کہ میری اور بکرم سنگھ کی ملاقات کسی گلی کے موڑ پر، کبھی بازار کے نکڑ پر، کسی سینما کے دروازے پر ہو ہی جاتی ہے، مصافحہ ہونے کے بعد ہر دفعہ بالکل یہی مکالمہ ہوتا ہے۔

"اخاہ، آپ ہیں"

"اوہو کہئے کدھر تشریف لے جا رہے ہیں"

"کبھی ملئے تو سہی"

"لگا ہے گا ہے تو نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے"

"ہی! ہی! ہی!"

"ہا! ہا! ہا!"

"اچھا، شکریہ"

"شکریہ!"

چلے جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ آخر انسان اس قدر بیوقوف کیوں ہیں؟ کہ تھیٹر سینما وغیرہ دیکھتے ہیں، یہاں تو اس دنیا کی سٹیج پر ہر کوئی شکسپیئر اور اور آغا حشر ہے،

کبھی کسی سینما کے دروازے پر ایک صاحب)

"ہیلو، ہیلو"

"ہیلو، ہیلو"

کیا آپ لاہور ہی میں ہیں (گویا یقین نہیں آتا، میں سمجھا تھا دیو داس کا ایکٹنگ کر کے) کہ آپ کہیں لاہور سے باہر چلے گئے ہیں (اب کوئی ان سے کیسے پوچھے کیوں بھئی یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں لاہور سے باہر چلا گیا تھا) آپ بی۔اے میں پڑھتے ہیں نا! (آج سے دو سال پہلے اسی سینما کے دروازے پر ملے تھے اور بالکل یہی گفتگو ہوئی تھی) بڑی مشکل سے ضبط کر کے جواب دیتا ہوں، نہیں جی۔ میں نے تو بی۔اے دو سال ہوئے پاس کر لیا تھا آج کل منٹو پارک میں گنڈیریاں بیچتا ہوں۔

"اوہ ٹھیک یاد آیا، معاف کرنا ——— اوہ ——— اچھا پھر ملاقات ہو گی میں آج کل چنگڑ محلے رہتا ہوں، کبھی آئیے نا صفاچٹ لانڈری کے قریب"

چلے جاتے ہیں۔

میری جان پہچان کے ایک اور بھلے مانس ہیں۔ اُن کی اور میری واقفیت صرف دو فقروں تک محدود ہے۔ ان سے ملاقات گو بہت مختصر ہوتی ہے مگر نہایت

مہذبانہ طریق پر ہوتی جاتی ہے۔ پہلے تو دُور سے مُسکرانا شروع کر دیتے ہیں جس کے جواب میں مجھے مسکرانا پڑتا ہے۔ میں یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ وہ مسکراتے کیوں ہیں؟ قریب آکر ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرتے ہیں۔ پھر

"مزاج مبارک"

"مزاج مبارک"

اس کے بعد چند ثانیے پھر مسکراتے ہیں۔ اور پھر

"آپ ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں نا؟"

"جی ہاں"

مسکراتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ برسوں سے ملاقات ہے، کبھی اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے تو سودائی معلوم ہوتے ہیں۔

کہاں تک گنواؤں، میرے ہوسٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک بابوجی رہتے تھے۔ ان سے واقفیت صرف اتنی تھی کہ وہ کبھی مجھ سے بلیڈ ادھار لے لیا کرتے تھے۔ اور میں کبھی اُن سے فونٹین پن کی سیاہی مانگ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کا ایک قریبی رشتہ دار تھا۔ جو ایف۔ اے میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا، پس میری توشامت آگئی۔ میں ذرا کمزور طبیعت کا آدمی ہوں۔ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ پانچ سال بورڈنگ کی روٹیاں کھا کر آخر میرے دماغ نے عدم تشدد کے فلسفے کو قبول کر لیا ہے۔ اب مجھ میں یہ جرأت ہی نہیں کہ اُنہیں کہہ سکوں، بھائی جان آپ کیوں مفت میں میرا مغز چاٹ رہے ہیں، خدا کے لئے کمرے سے باہر تشریف لے جائیے۔ پھر ہماری طبیعتوں میں رتّی بھر مطابقت نہیں ہے، میں سینما پسند کرتا ہوں تو وہ تھیٹر

کے دلدادہ ہیں۔ میں انگریزی ادب کا عاشق ہوں۔ تو وہ ریاضی۔ برجان چھڑکتے ہیں۔ میں سیر کرنا بہتر سمجھتا ہوں تو وہ سرسوں کے تیل کی مالش، لے دے کے بس وہی ان کا رشتہ دار ہے جو کبھی میرا ہم جماعت تھا، بس اُسی کے متعلق گفتگو ہو گی۔ گویا جہان بھر میں مجھے اور کسی کے ساتھ دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی۔

آخر ایک دن کرنا خدا کا کیا ہُوا کہ اُنہیں تار آگیا کہ وہ ہمارا باہمی دوست چل بسا، سچ جانئے میں تو بہت خوش ہوا کہ چلو خلاصی ہوئی۔ مجھے اور مرنے والے کو بھی اِس روحانی کوفت سے نجات ملی، چند روز آرام سے کٹے، چند روز اس لئے کہ یہ صاحب تعزیت کرنے کے لئے مرحوم کے گھر تشریف لے گئے، مگر واپس آتے ہی پھر وہی بک بک جھک جھک۔

"اجی وہ آپ کو بہت یاد کرتا تھا، اپنے سب دوستوں کو . . . یاد کرتا تھا بڑا نیک آدمی تھا" مرنے والے غریبوں پر بہت سی تہمتیں تراشی جاتی ہیں، ان صاحب نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

"جب وہ مرا ———————"

(۱) اُس نے اپنے سب دوستوں کو یاد کیا۔ (چاہے بیچارے کو ہچکی لینے کا بھی موقعہ نہ ملا ہو اور وہ اختلاجِ قلب ہی سے چل بسا ہو)۔

(۲) جی مرنے کے بعد اُس کی صورت بالکل نہیں بگڑی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سویا ہے، آنکھیں ذرا ذرا سی کھلی تھیں۔

(۳) اجی اسے اپنے مرنے کا پتہ تھا۔ چھ مہینے بیشتر ہی سے وہ اداس سا رہتا تھا، نہ کسی کے ساتھ بولنا، نہ کھیلنا، نہ ہنسنا، جیسے موت سامنے کھڑی ہو، اُف آخری بار

جب وہ مجھے ملا، تو پچھلے سال کی بات ہے وہ مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا، یکایک اُس نے مجھ سے پوچھا، کیوں بھئی رفیق کیا بجا ہوگا؟ میں نے کہا ساڑھے آٹھ، کہنے لگا ساڑھے آٹھ، اُف ساڑھے آٹھ، گاڑی ابھی تک نہیں آئی، اچھا مجھے اجازت دو۔ میں چلتا ہوں، دفتر جانا ہے - یہ کہہ کر وہ چلا گیا- اس کے چہرے پر ایک عجیب اداسی تھی - اتنا کہہ کر آپ چپ ہو گئے -

میں نے تنگ آکر پوچھا "مگر اس کا اس کے مرنے سے کیا تعلق؟"

" تعلق؟ آپ نے حیران ہو کر کہا،" صاحب تعلق یہ ہے کہ اس واقعہ کے دوسرے سال اسی دن عین ساڑھے گیارہ بجے مر گیا، ذرا خیال تو کیجئے، پورے ایک سال بعد، اُسی دن اور ساڑھے آٹھ بجے کے پورے تین گھنٹے بعد اب دیکھئے اس دن ساڑھے آٹھ بجے آٹھ بجنے کے چند منٹ بعد ہی گاڑی آگئی - اور اس نے ساڑھے گیارہ بجے مجھے لاہور پہنچا دیا، کتنی حیرت کی بات ہے -

میں نے بالکل زِچ ہو کر کہا، " خدا کے لئے اس بکواس کو بند کرو اور آئندہ کبھی اس کمرے کا رُخ نہ کرنا، ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا"۔

یہ جان پہچان کے لوگ کسی غریب کی لاش کو خراب کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی کسی سے "جان پہچان" نہ رکھے، چند دوست بنائے۔ اور بہت سے دشمن، ترقی کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی حربہ نہیں - اتنا لکھ چکنے کے بعد دل میں خیال آتا ہے، کہ آخر میرے بھی بہت سے ایسے احباب ہوں گے جو مجھے فقط اپنی جان پہچان کے لوگوں کے زمرے میں شمار کرتے ہوں گے، اُف کتنی بھول ہوئی - اچھا تو جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے واپس لیتا ہوں!

٭

غسلیات

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیقِ حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں بڑے بڑے چلّا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ اُس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ جس کے نام سے ڈاروِن کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں، مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ

نفریں رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آچکے ہیں اور کچھ بہت پُر اُمید نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگر مچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر دو ہزار افراد کے لئے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیار پور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں!

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا، میں مستقبل کے متعلق اس قدر نا امید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض اک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پُر امید ہونے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں۔ انہیں بہ تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، نہانا ایک انفرادی فعل ہے، اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول، عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے

نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا "ارے یار، تونے تو لٹیا ہی ڈبو دی!" ذرا خیال کیجئے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے، خوددار، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اُسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ———،

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ ——— پوربیا، تبیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے ——— ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے ——— پروفیسر، کالج کا لڑکا

دس بجے ——— صاحب بہادر، لیڈر

بارہ بجے ——— منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے۔ تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اُس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے"۔ اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو

سوراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جبکہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنّت نشان سے قطعاً مٹ جائیگی صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو، سنیچروار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کرینگے "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہُوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری امّاں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھر جھری لیکر) واہ، واہ اُس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے۔ اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے، کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا ہے، میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتۂ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست

نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ رہا قی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی
ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا
رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم
تھے ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے مبادا ہوا
کا کوئی تیز و تند جھونکا انہیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے پھونس کے
جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے۔ جس نے اُن کو ابھی تک زندہ
رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے کاغذی جسم
پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب
اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچکر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا "ہو نہ ہو میرے
اُس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے، اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا
ہی اچھا ہوتا"۔

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے
نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے کہیں
وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے
نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے
جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اُسے

ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے دریا پہ گئی اور نہا کر گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پہ پھیلائے ہوئے تھے، اُس کے چہرے پہ ایک عجیب چمک تھی، اور اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اُسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جان بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں، اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں، "اسے میں نہ دونگا، اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے!"

نتیجہ:۔ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہو گا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈا کیا جانا چاہیئے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے۔ بغیر پروگرام کے آجکل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۳) دفعہ ۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں :۔

" ہر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ جو غریب شخص بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائیگا ۔ اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائیگا ــــــــــــ

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا ، کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا ۔ اور بولا " بابوجی ، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے ، آپ جلدی نہالیں ، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائیگا " میں قلم چھوڑ ، میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر ۔ یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا ۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بدصورتی

اسے میری بدذوقی سمجھئے یا میانہ روش سے بچکر چلنے کی عادت، بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ خوبصورتی پر ترجیح دیتا ہوں، خوبصورت چیزیں دیکھ کر میں ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوبصورتی تو ایک عارضی شے ہے، شفق کی طرح جلد مٹ جانے والی، قوسِ قزح کی طرح گُم ہو جانے والی، لیکن وہ چیز جو ہمیشہ قائم رہتی ہے، وہ جس پر ہمارے حسّیات بھروسا کر سکتے ہیں، جس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے بدصورتی، اور اس دنیا میں تو ہر شے چاہے اُس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچکر بالضرور بدصورت بن جاتی ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے —— لیکن بدصورتی ہمیشہ قائم رہتی ہے، شروع سے لیکر آخر تک، تو پھر کیوں اُن چیزوں کی طرف توجہ دی جائے

جو عارضی ہیں، وقتی اور ناپائدار، اور بشر اپنے دل کو اُن چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جن کی حیثیت ابدی و دوامی ہے، جو کبھی بدل نہیں سکتیں، جن کی ہیئت میں کبھی انقلاب نہیں آسکتا، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی صوفیانہ لغزش کا نتیجہ نہیں، ان کی اساس خالصتہً فلسفیانہ ہے، اُسے مذہب، آرٹ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق نہیں خوبصورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصلاح ہے جس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے، لیکن کسی بدصورت چیز کے متعلق ہر وقت اور ہر لمحہ نہایت وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بدصورت ہے، اور یہی بدصورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے، علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جزو لاینفک ہے، اس کے بغیر خوبصورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی، حُسن کی بنیادیں بدصورتی پر استوار ہوتی ہیں، اور اس لحاظ سے بدصورتی بھی ایک طرح کا حُسن ہی ہے۔ آئن سٹائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دُنیا میں سُکھ کے ساتھ دُکھ، پھول کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصورت مرد رہتے ہیں۔

روحانی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں اصلی حُسن صرف بدصورتی میں ہے۔ مثال کے طور پر آپ دُنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صورتوں کی طرف توجہ کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دُنیا کے "بڑے آدمی" بنتے ہیں۔ بچارے خوبصورت آدمی تو عام طور پر فوج

میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصورت آدمی اُن پر حکومت کرتے ہیں، دور کیوں جایئے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورتیں ملاحظہ کیجئے۔ سوائے چند مستثنیات کے باقی سب وہ ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آتی ہے، میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدصورت آدمیوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے، چنانچہ اس بیسویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لیے سینکڑوں طریقے برتے جا رہے ہیں، میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ کہ دنیا کے بڑے بڑے رہنما بڑے بڑے امیر، فوج کے جرنیل، ادیب، فلسفی سائنسدان بے حد بدصورت واقع ہوئے ہیں۔

دراصل مجھے بدصورتی سے ایک گونہ عشق سا ہو گیا ہے، لوگ تو خوبصورت عورتوں پر مرتے ہیں، میں بدصورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں اور جب کبھی میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوانوں کی طرح جوان موقعوں پر "لڑکی کیسی ہے؟ خوبصورت ہے نا؟ رنگ کیسا ہے؟ قد و قامت؟" اور اس قسم کے سوالوں کا تانتا باندھ دیا کرتے ہیں۔ میں بھی اول جلول بکنے لگ جاتا ہوں، مثلاً

"لڑکی بدصورت ہے؟"

"ہاں!"

لیکن محض "ہاں" سے میری تسلی نہیں ہوتی، چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں۔

"کیا اُس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماوس کی رات۔

"ہاں، ہاں، اطمیناں رکھو۔"

"اور دانت ؟"

"میلے اور سُرخ! شاید پان بہت کھاتی ہے۔"

"بہت خوب... اچھا!... مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟"

"آنکھیں؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور بال بھی تو گھنگھریالے ہیں...."

"چچ... چچ... چچ... میں ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہوں" یہ تو بہت بُری بات ہے۔"

اور اس طرح یہ ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اِسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص موجود تھا، کسی کا رنگ کھلتا ہوا تھا، تو کسی کی ناک ستواں، کسی کی کمر پتلی تھی، تو کوئی سرو قد، غنچۂ امید کھلا پر نہ کھلا۔ اور گو اب میری عمر تیس سے کچھ اوپر ہے، مگر پھر بھی پُر امید ہوں اور ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو کامل بدصورت ہو... ایک بار!... منٹو پارک لاہور کی نمائش میں ایک ایسی عورت دیکھی تھی جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ "وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ"، لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیاہتا نکلی!

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جا سکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری، شاعر لوگ کہتے ہیں تو صرف حسین چیزوں کی تعریف میں۔ حسین عورتیں، حسین پھول، حسین وادیاں، بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگرمچھ کی شان میں

بھی طبع آزمائی کی ؟ کسی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی ؟ اگر نہیں تو بس پھر بدصورتی ایک بیکار شئے ہے،،

کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان دلائل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ شاعر لوگوں سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی سطحی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس اہم سوال کے حسن و قبح پر غور کرسکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے . . . سبب کماکھاتے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیّت سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو آج بلبلوں اور گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں، کل کوے اور بھنگ کی کونپلوں پر طبع آزمائی کرنا شروع کردیں ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگوں کی ذہنیت میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو، لیکن میں اس پہ کبھی شاعروں کا اعتبار نہیں کرونگا۔ کیونکہ شعر کہنا بذاتِ خود ایک خوبصورتی ہے اور خوبصورتی کا اعتبار کیا ؟ خود شاعروں نے اپنے لاکھوں شعروں میں حسن کی بیوفائی اور خوبصورتی کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے، پھر یہ لوگ کس طرح بدصورتی کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں۔

خوبصورتی فساد کی جڑ ہے ، اور نیفر اور دصات کے زمانے سے لیکر آجتک خوبصورتی دنیا کے امن کو تباہ برباد کرتی چلی آئی ہے، خوبصورت چیزوں کے حصول کیلئے لوگوں نے اپنی جانیں گنوادیں۔ تہذیبیں مٹ گئیں اور قومیں فنا ہوگئیں، لیکن ہم ہیں کہ اسی جنون خیز وارفتگی سے پرانے راستے پر بڑھکے جارہے ہیں،

خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، اس دیوانگی کے جوش میں ہم نہیں سوچتے کہ امنِ عالم کیوں خطرے میں ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو اقوامِ عالم میں اتحاد نہیں ہونے دیتی؟ لوگ کیوں لڑتے ہیں؟... اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں بنائے نزاع محض خوبصورتی ہے، لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کے لئے، خوبصورت خیالوں کیلئے، خوبصورت عورتوں کے لئے، خوبصورت خطّوں کے لئے، خوبصورت ملکوں کے لئے، اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیّت کو سمجھ جائیں، تو امن قائم ہو سکتا ہے، گذشتہ دس بارہ ہزار سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں۔ تاریخ کے اوراق اُس پر گواہ ہیں ضرورت اس امر کی ہے، کہ ہم لوگ خوبصورتی کے مضر خواص سے واقف ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کے لئے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں۔ یہ فضول باتیں ہیں، آخر ہماری انسانی زندگی کی اساس خوبصورتی پر تو نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورت قسم کی باتوں ہی پر ہے۔ مثلاً روٹی، پانی، کپڑا......

رونا

مثل مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ کہنے کو تو سچ ہے، لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ "ہم" سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے۔ کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ گانا تو خیر کبھی کبھی سن لیتے ہیں اور اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پر چلتے ہوئے۔ لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب و محبوب مشغلہ ہے، اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے۔ کہ آخری بار جب وہ روئے تھے۔ اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ "اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہو گئی تھی۔" پھر میری

طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے "آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوتی ہے۔ تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یونہی رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں، لوگ کیا کہیں گے۔"

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کہ ہر شریف انسان اُسے بُرا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بیشک ایک اچھی چیز ہے۔ لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت۔ بچپن میں جب ہم روتے تھے۔ تو اکثر بار بار پچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے، بلکہ کئی لوگ پچکارتے بھی نہ تھے۔ وہ کہتے تھے، اچھا ہے، خوب روؤ۔ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے۔ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو جائے تو لوگ اسے بزدل، زنانہ مزاج، پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بیچارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں یا ایک آدھ ہلکی سی چیخ بھی منہ سے نکل جائے تو اُسے ہیجڑا کہہ دیتے ہیں انہیں کوئی تامل نہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز جو بچوں کے لئے مفید ہے اُن آدمیوں کے لئے جو اب بچے نہیں ہیں، کیسے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں، کہ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ اس سے چھاتی کھلتی ہے، پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر آنکھ کی پتلیوں کو صاف کرتے ہیں، ناک کے نتھنوں سے ریشہ جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے۔ رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے، الغرض رونا کشتی کرنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے، پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں۔ سوال یہ ہے کہ

کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں ۔ میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت تھی، تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے ۔ غالباً بچوں کے دن رات رونے کی وجہ ہی سے تپدق نہیں ہوتا ۔ اگر ہم لوگ بھی دن میں دو تین گھنٹے رو لیا کریں، تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نزدمہ ہو نہ زکام، آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے کتنے بچے چشمہ لگاتے ہیں اور کونسا بوڑھا یا جوان ہے ۔ جو چشمہ کی حاجت نہیں محسوس کرتا ۔ لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدرشن مکر دھوج، گولڈپر، ماء اللحم، شربت فولاد استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر ان قیمتی دوائیوں کے بجائے وہ قدرت کے بیش ترین اصول برتیں ۔ اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں ۔ تو جہاں جسم طاقت ور رہے، وہاں دن بھر دل میں امن سکون بھی رہے ۔ اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے خود بخود مٹ جائے ۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے جسم کی غذا ہے نہ صرف جسم کی بلکہ روح کی غذا بھی ۔ ایسی مفید عادت کے لئے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کیلئے عالمگیر پروپیگنڈہ کی ضرورت ہے اس کے لیے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں ۔ سکولوں اور کالجوں میں رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے ۔ ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رو رہے ہوں ۔ مثلاً ہٹلر، مسولینی ۔ چیانگ ریکشک، بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر عوام پہ بہت اچھا اثر پڑیگا ۔ اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے ۔ ذرا تصور کیجئے ایک بڑا سا سینما ہال ہے ۔ جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رو رہے ہیں کتنا

خوبصورت منظر ہے۔ کیا یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح رونا بھی بطور ایک ورزش کے سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے قریب میدانوں میں لاکھوں آدمی کھڑے کئے جائیں جو چیخیں مار مار کر روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنا لیں۔ اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں۔ ملکۂ موسیقی کی طرح ملکۂ گریہ، "رونے کا بادشاہ"، وغیرہ وغیرہ۔ اس پروگرام کو مقبولِ عام بنانے کے سینکڑوں طریقے برتے جا سکتے ہیں۔ صرف نمونہ کے لئے چند ایک یہاں درج کئے ہیں۔ تاکہ سند رہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپیہ کے ٹکٹ بھیج کر الراقم سے خط و کتابت کر لیں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں۔ بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بعض بچے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں، وہ اکثر گھنٹوں کیا کئی کئی دن روتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی کھاتے ہیں کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لیکر لگاتار روتے رہتے ہیں میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا نہ کر سکیں گے، یوں بھی تو بذاتِ خود یہ کوئی کم کارنامہ Achievement نہیں۔ اور میں تو اسے اتنی ہی ہمت دیتا ہوں جتنی کہ واٹرلو کی لڑائی، فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملہ کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے۔ جیسے برسات کی بارش، ذرا اُستاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا، اُدھر تبسّم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش پل میں دھوپ۔ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے۔ لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے۔ عجلت پسندی اور غیر مستحکم ارادوں کی، بس ان کا نام لڑکپن ہے اور شباب تو اُس سے بھی بڑا ہے اوّل تو جوان ہو کر لوگ روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس

جگہ جہاں نہ کوئی دیکھ پائے نہ سُن سکے جیسے کسی گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یونہی کبھی کبھی رسماً آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں، اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ۔ لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں، مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے۔ کہ ہُو ہُو ہُو کر کے لبوں پر جھاگ لا کر آنسوؤں سے سفید سفید داڑھی کو تر کر لیا جائے، یہ رونا ہی نہیں بلکہ رونے کی ہنسی اڑانا ہے۔ در اصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا قصور ہے۔ در اصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں۔ رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر انہوں نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا۔ تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے، رونا ایک ورزش ہے، رونا ایک آرٹ ہے مؤخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے۔ میں نے وہ بچّے دیکھے ہیں۔ جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ دل میں رحم اور ہمدردی کا جذبۂ عمیق موجزن ہو جاتا ہے۔ اور وہ انہیں بازوؤں میں اٹھا کر پچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور عورتیں! ——— رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن، آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک ملتجی نگاہ اور شاید آج کی دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی۔ اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن ایک معاشری انقلاب آجاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کم بخت مرد رونا نہیں جانتے اور عورتیں آنسو بہا کر انہیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ وقت آ

گیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اِس دامِ فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے۔ اُٹھو مجاہدو اُٹھو سرفروشی کی تمنا ـــــ وغیرہ وغیرہ یاد رہے کہ ہماری آزادی کی بہتر صورت رونا ہے۔ خوب روؤ جی بھر کر روؤ۔ دن میں بار بار روؤ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے ؟

بیچلر آف آرٹس

بیچلر آف آرٹس! کتنا شاندار نام ہے۔ سنتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ کسی انگریزی مٹھائی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ یا کوئی اعلیٰ اعزازی خطاب۔ "رائے صاحب" اور "خان صاحب" تو اس کے سامنے بالکل بے جان اور ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ بیچلر آف آرٹس! انہیں ادا کرتے وقت زبان بھی چٹخارے لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کتنے شاندار الفاظ ہیں۔ ہیبت اور جلال سے معمور، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عظیم الشان عمارت کا نام ہے۔ ایسی عمارت جو تاج محل کی طرح خوبصورت اور قطب صاحب کی لاٹ کی طرح مضبوط اور بلند!

دراصل بیچلر آف آرٹس نہ تو کوئی انگریزی مٹھائی ہے نہ ہی کوئی اعزازی خطاب یا کوئی خوبصورت عمارت بلکہ یہ تو ایک غریب یتیم سی ڈگری کا پورا انگریزی نام ہے جسے عرفِ عام میں "بی۔ اے" کہتے ہیں۔ شاید آپ میری بات ماننے سے انکار کریں۔

اور غصہ میں آ کر کہیں۔ اجی صاحب! یہ آپ کیا کہتے ہیں کہاں بیچلر آف آرٹس جیسا حسین و قبول صورت نام، کہاں بچارا غریب بی۔ اے۔ ان دونوں میں کیا خاک مطابقت ہو سکتی ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی۔ اونہہ!

لیکن یہ ہے درست بیچلر آف آرٹس ہی بی۔ اے کا پورا نام ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ کیا آپ اپنے گھر کے بہشتی فیض احمد خاں کو "بھیجا" کہہ کر نہیں پکارتے۔ دفتر کے چپراسی منگل سنگھ کو "منگلو" چندر درشن کو "چندرو"۔ پھر اگر زمانے کے چکر سے بیچلر آف آرٹس سمٹ کر اور سکڑ کر صرف بی۔ اے رہ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ غربت میں ایسا ہی ہُوا کرتا ہے۔

لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب بی۔ اے کی معنوی حالت ایسی نہ تھی جیسی اب ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب ابھی ہم میں سے بہت سے نوجوان پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ اور غالباً شاہ جارج پنجم کی ابھی دہلی میں تاج پوشی بھی نہ ہوئی تھی تو اُن دنوں سُنا ہے کہ بی۔ اے کی ڈگری کا بہت رعب تھا۔ ہمارے محلہ میں ایک بوڑھے ڈپٹی صاحب رہتے ہیں۔ بڑے بھلے مانس ہیں۔ متین صورت، سفید ریش اور آنریری مجسٹریٹ۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کہنے لگے میاں صاحبزادے میں دیکھتا ہوں۔ تم آجکل اداس سے رہتے ہو۔ اور اکثر آوارہ پھرتے رہتے ہو۔ لیکن جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو بی۔ اے پاس کر کے فوراً تحصیلدار بن گئے تھے۔ ان دنوں ہمارے پتا جی گلیوں میں "آلو چھولے گرما گرم" بیچا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنا اور گاہکوں کا پیٹ کاٹ کر پڑھایا۔ اور ایک تم ہو کہ بی۔ اے پاس ہو۔ ملازمت ابھی تک کہیں ملی نہیں۔ اور ہر وقت ہیٹ بوٹ سوٹ ڈانٹے رکھتے ہو۔ اس طرح پندرہ بیس منٹ وہ لمبا چوڑا وعظ

سناتے رہے اور جب چپ ہوئے تو میں نے نہایت نرمی سے اور برخوردارانہ انداز میں سر جھکا کر کہا۔ حضور آپ نے کس سن میں بی۔اے پاس کیا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے آنکھیں بند کر کے اور حافظے پر زور دے کر کوئی سال بتایا وہ سن اب مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ اٹھارہ سو کیا؟ لیکن بہرحال وہ سن قبل از مسیح نہیں تھا۔

اور اس طرح کی رومانی داستانیں غالباً آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ ایک رنگریز کا بیٹا جو بی۔اے پاس کرنے کے بعد وظیفہ پر ولایت بھیجد یا گیا۔ اور وہاں سے واپس آتے ہی فوراً چیف انجنیئر بن گیا۔ ایک پٹواری کا صاحبزادہ جو ایک دن اپنے باپ کا حاکم بنا اور جسے انجام کار اپنے باپ ہی کو رشوت ستانی کے الزام میں ملازمت سے برطرف کرنا پڑا۔ ایک غریب تیلی کا بچہ جو بی۔اے پاس کرنے کے بعد آئی۔سی۔ایس بنا اور جس کے ڈرائنگ روم میں آج بھی ایک چھوٹا سا چاندی کا کولہو بطور یادگار منٹل پیس پر رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک گنڈیری بیچنے والے کا لڑکا ایک خانساماں کا نواسا۔۔۔ پرانے زمانے کی عجیب و غریب حکائتیں دلچسپ شیریں اور پرکیف جنہیں پرانے زمانے کے پنشن یافتہ بزرگ یا بڑی بوڑھی خالائیں سردی کے دنوں میں انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر کم عمر اور خام عقل انڈر گریجیوٹوں کو سنایا کرتی ہیں۔ میں انہیں "بی۔اے کی کہانیاں" کہا کرتا ہوں۔ اور یہ بی۔اے کی کہانیاں اتنی ہی میٹھی اور دلنواز ہوتی ہیں۔ جتنی الف لیلیٰ کی داستانیں اور اتنی ہی حیران کن۔ انہی افسانوں کو سُنکر بیچارے غریب انڈر گریجویٹ نئے نئے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔ خوبصورت ہوائی قلعے، کبھی عالم خیال میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے اردگرد وکلاء اور بیرسٹر "مائی لارڈ"

مائی لارڈ کہہ کر کورنش بجالا رہے ہیں یا وہ کپتان پولیس بن گئے ہیں، اور گھوڑے پر سوار ہو کر بازار سے گزر رہے ہیں۔ ان کی دستار کا سفید طرّہ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اور لوگ اس سفید پرچم کو جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں۔ یا پھر وہ آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں چوتھے نمبر پر آئے ہیں۔ والد کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ انہوں نے شہر کے سارے بینڈ اپنے گھر کے دروازے پر اکٹھے کر لئے ہیں۔ ۔ ۔

مگر نہیں یہ سب دھوکا ہے۔ دھوکا اور مایا!

یہ کچھ تو ان بی۔ اے کی سُنی سُنائی کہانیوں کا اثر ہوتا ہے اور کچھ جوانی کی اُبلتی ہوئی مستی کا کہ بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد کچھ عرصہ تک ایک نوجوان کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری رہتا ہے۔ اور اپنے تئیں ایک بہت بڑا انسان سمجھتا ہے اِس وقت اس کی نگاہ میں بی۔ اے کے امتحان کی اہمیت واٹرلو کی لڑائی، سکندر کے حملے اور ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم سے کم نہیں ہوتی۔ وہ جب گھر والوں سے بات کرتا ہے تو اس طرح ایک باوقار مہذب مجلسی طریق پر گویا وہ خود اپنے ہی گھر میں ایک مہمان ہے آدابِ نشست و برخاست میں اس کی کیفیت اور بھی مضحکہ خیز ہوتی ہے، مثلاً جب کرسی پر بیٹھتا ہے۔ تو اس طرح محتاط اور چوکنا ہو کر گویا وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے اور اسے ہر لحظ وہاں سے گر پڑنے کا اندیشہ ہے اس کی گردن اور چھاتی کا تناؤ ان دنوں اتنا شدید ہوتا ہے کہ بیچاری ماں اسے بار بار پوچھ لیتی ہے کیوں بیٹا وحید تمہاری گردن کو کیا ہوا ہے۔ کہیں کوئی بل تو نہیں پڑا۔ لاؤ ذرا مالش کر دوں۔ جس سے بیٹا وحید اور بھی چڑ جاتا ہے اور جب وحید بازار میں نکلتا ہے۔ تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے جسم کے روئیں روئیں پر "بی اے" لکھا ہے۔ اور لوگ اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں "لو دیکھو وہ جا رہا ہے۔ عالی ہمت نوجوان جس نے اس سال بی۔ اے پاس کیا ہے۔

لیکن یہ ہذیانی کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی ۔اور اس امر کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے ۔کاش آپ اس روز یونیورسٹی کے ہال کے دروازے پر کھڑے ہوتے کہ جس روز میں وہاں سے سیاہ گون میں ملبوس ۔آنکھوں پر چشمہ لگائے ، ہاتھ میں بی ۔اے کی ڈگری لئے خراماں خراماں باہر نکلا ۔دس نومبر ۱۹۳۶ء کی سہاونی صبح تھی۔ اور یونیورسٹی ہال کے پرانے کلاک سے لیکر تانگے والے کی آواز تک دنیا کی ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی ۔یہاں تک کہ انارکلی کے دکاندار بھی ہمیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور بے اختیار ہنس رہے تھے ۔ہم لوگ ٹولیاں بنائے ریشمی گونوں کی سرسراہٹ کی موسیقی کو سنتے ہوئے انارکلی بازار میں گئے ۔اور فوٹو کھینچنے والوں کی دکانوں میں گھستے گئے۔ یہاں کتنی بھیڑ تھی ، کتنا شور و غل ۔ہر طرف سیاہ گون ، دلچسپ باتیں اور بلند قہقہے چیبر لیو اور مائی ڈیر کی آوازیں ، تصویر کھچوائی ، پھر راستے میں ایک رائٹنگ پیڈ کیلئے بھی آرڈر دیا گیا ۔لالہ پیرا رام بی ۔اے ، ملک اللہ بخش بی ۔اے ، سردار لچھمن سنگھ بی اے غرض نام سے نہیں بلکہ فقط بی ۔اے کی نمائش سے تھی ۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ۔یہ گھر والوں کے چاؤ چونچلے ، دوستوں بزرگوں اور رشتہ داروں کی دلداریاں چند روزہ تھیں ۔چند دنوں تک ہماری ہر طرح دلداریاں ہوتی رہیں ۔قرض کے پردے میں دینداریاں ہوتی رہیں ۔اور چند دنوں تک ہم نے بھی یہی سمجھا ۔کہ اب ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم آیا ۔کہ اب آیا کہ سرکار تمہارے بی ۔اے کی ڈگری حاصل کر لینے پر بہت خوش ہے اور عالی ہمتی کے صلے میں وہ تمہیں تحصیلدار ، ڈپٹی یا پولیس کپتان کا عہدہ سونپتی ہے لیکن جب دن کیا مہینے گزر گئے اور سوائے ایک سائیکل کے چالان کے اور کوئی

سرکاری پروانہ نہ آیا۔ تو ہم نے سوچا۔ کہ اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ کوشش کرنی چاہیئے۔ عین ممکن ہے۔ کہ سرکار کو ہمارے بی۔اے پاس کرنے کا پتہ ہی نہ ہو۔ اتنی بڑی سرکار ہے۔ اور آخر انہیں اور بھی بہت سا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، تو اسی طرح سوچ سمجھ کر آخر ہم آئی سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ بقولِ حضرت علامہ مرحوم

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہاں بی۔اے سے بھی اوپر ڈگریاں ہیں۔ اور ان کے مالک بھی یہاں امتحان کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ دل میں کچھ مایوسی سی ہوئی۔ اسی تذبذب میں پرچے بھی اچھے نہ ہوئے اور رہی سہی کسر انٹرویو نے پوری کر دی۔ یہ انٹرویو بھی عجیب بلا ہے ہم نے یہ مضمون بی۔اے میں کاہے کو پڑھا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی۔ کہ میں بطور احتیاط والد صاحب کی سونے کی گھڑی ساتھ لیتا گیا تھا۔ جو انہیں انعام میں ملی تھی ورنہ نہ جانے کیسی زک اٹھانا پڑتی۔ انٹرویو کمیٹی کے صدر بہت مہربان طبیعت کے مالک تھے مجھ سے نہایت نرمی سے کہنے لگے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا نام بتایا۔ تو کمیٹی کے ایک صاحب جھٹ بول اٹھے۔ ڈرتے کیوں ہو۔ کھل کر بات کرو۔ یہاں تمہیں کوئی کھا تو نہیں لے گا۔

میں نے کہا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرا باپ اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔ کمیٹی کے ممبروں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن مجھ سے کوئی جواب نہ

بن پڑا۔ آخر جب میری خاندانی خدمات کا سوال آیا۔ تو میں نے جھٹ جیب سے گھڑی نکال کر سامنے رکھدی۔

یہ کیا ہے؟ صاحبِ صدر حیران ہو کر بولے۔

یہ ایک گھڑی ہے۔ میں نے جھٹ جواب دیا۔

ہاں، ہاں۔ یہ تو میں بھی دیکھتا ہوں کہ یہ ایک گھڑی ہے۔

میں نے مسکرا کر کہا، جنابِ والا! یہ گھڑی سونے کی ہے۔ اور میرے والد کو انعام میں ملی ہے۔

بہت خوب! ایک ممبر نے پوچھا۔ کوئی اور خدمات ______،

میں نے کہا۔ لڑائی میں میرے دادا کے دادا کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی۔

اس کا کوئی ثبوت۔ کوئی سرٹیفکیٹ!

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ سرٹیفکیٹ تو کوئی نہیں۔ لیکن دادی اماں نے مجھ سے یہ بات اکثر بیان کی ہے کہ میرے دادا کے دادا . . .

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہنس پڑے۔ آخر صاحبِ صدر نے مجھ سے کہا، "You can go now"

میں جیب میں گھڑی ڈال کر باہر نکل آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب آئی سی ایس کا نتیجہ نکلا تو میرا نام بھی موجود تھا۔ لیکن دو سو ننانوے نمبر پر۔

آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کے بعد بیچارا غریب بی۔ اے کئی چکر کاٹتا ہے۔ اور کئی پاپڑ بیلتا ہے۔ کبھی انٹرویو میں فیل کبھی باقی پرچوں میں صفائی۔ فوج اور پولیس میں کوشش کی۔ تو قد چھوٹا نکلا۔ یا اگر قد ٹھیک تھا۔ تو چھاتی چھوٹی نکلی۔ غرضیکہ ہر طبعی معائنہ پر اس

عورت بجز رنگ و بو کچھ بھی نہیں
میں خدا ہوں اور تو کچھ بھی نہیں

یہ اشعار تعریف سے مستغنی ہیں۔

لیکن جہاں ان کے اشعار میں تصوّف ہے۔ وہاں اُن کا دل وطنی جذبات سے بھی خالی نہیں۔ اور در اصل وہ تو تصوّف ہی میں ہندوستان کی نجات دیکھتے ہیں اس شعر کو سنئے :-

اس غریب ملک کی قسمت پھر کبھی نہ کھوٹی ہو
جو سر پر ایک عمامہ ہوا در تن پر ایک لنگوٹی ہو

انگریز بھی اس بندہ ہے ہم بھی اسکے بندے ہیں
یہ الیکشن یہ اسمبلی سب مکر و فریب کے پھندے ہیں

کیوں امیر و غریب کے یہ جھگڑے ہیں الحذر
جب موت ہے قریب اور ایک ہے قبر

حاکم و محکوم کوئی نہیں یہ سب مایا کا جال ہے
اُٹھا پردہ خبردار دیکھ سب کا ایک حال ہے

الغرض حضرت ماہی مچھلی شہری کا کلام بلاغت نظام اس قسم کے پند و نصائح سے مالا مال ہے۔ ہندوستان کا کوئی کتب خانہ اس مجموعہ کلام سے خالی نہیں مضامین

اچھے لکھائی چھپائی اچھی ۔مگر کاغذ اچھا نہیں۔کتاب کے شروع میں
جناب غور فسکر آبادی ،شور عظیم آبادی ۔ دلیر فصیح آبادی اور حسر فخر آبادی
کے دیباچے شامل ہیں۔حضرت مچھلی ماہی شہری کی ایک تصویر بھی شامل ہے
جس میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھے "رموز تصوف" کا مطالعہ کر
رہے ہیں ۔ اپنے کتب فروش سے طلب کیجئے ۔اور اگر اپنے کتب فروش
سے نہ ملے تو سیدھے مچھلی شہر سے منگوائیے ::

میں نے جاپان میں کیا دیکھا؟

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ اچھا صاحب، آپنے جاپان میں کیا دیکھا؟ میں جاپان کب اور کن حالات میں گیا تھا۔ اس کا تذکرہ بعد میں کرونگا) میں ان لوگوں کو جاپان کے حالات سنا سنا کر اس قدر تنگ آگیا ہوں اور مجھے اب جاپان کے عوام اور اُن کی تہذیب و تمدن کے متعلق اتنی باتیں ہر روز سنانا پڑتی ہیں۔ کہ اب میں نے خوشنودیٔ احباب و رفاہِ عام کے لئے ان تمام باتوں کو ان قیمتی اوراق میں محفوظ کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے اس جھنجھٹ سے نجات پاؤں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اِس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آگیا۔ جو میں قارئین کی تفننِ طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں استاذی مکرم فی ٹی پی پا کی میئت میں (خواہ مجھ سے املا میں غلطی ہو گئی۔ میرا مطلب ہے معیّت میں) یوکوہاما پہاڑ پر سیر کرنے کے لئے گیا۔ یوکوہاما پہاڑ جاپان کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اور استاذی مکرم فی ٹی پی پا یوکوہاما یونیورسٹی میں (جو کیلول پہاڑ کی چوٹی واقع ہے۔ اور سال میں صرف نو مہینے بند رہتی ہے) طبعیات کے لکچرار ہیں۔ اس لئے سفر بہت دلچسپ رہا۔ راستے میں انہوں نے مجھے جاپان کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں بتائیں۔ بالخصوص جاپانی پہاڑوں کی ساخت کے متعلق مثلاً "یہ چٹان لاوے سے تیار کی گئی ہے"۔

"کس نے تیار کی تھی؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

استاذی مکرم برا نہ تکنے لگے۔

میرا مطلب یہ ہے "اس کا موجد کون تھا؟" میں نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔

فی ٹی پی پا ہنسنے لگے۔ بات یہ ہوئی، کہ میں نے گھبراہٹ میں ہندوستانی بولنی شروع کر دی۔ فی ٹی پی پا کو اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ صرف ایک لفظ، موجد، وہ سمجھ گئے۔ کیونکہ موجد جاپانی زبان میں "قدرت"، کو کہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ ہاں درست ہے۔ اس لاوے کی چٹان کو قدرت نے ہی تیار کیا تھا۔ اور اس چٹان پر ہی کیا موقوف ہے۔ یہ سب پہاڑ اور پائن کی چوٹیاں، یہ چیری کے پھول۔ یہ سب قدرت نے ہی بنائے ہیں۔

الغرض بہت لطف رہا۔ راستہ بھر وہ جاپانی چٹانوں اور زمین کی تہوں کے متعلق میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ اس چٹان میں سیسہ ہے" اس میں لوہے

کی آمیزش ہے "" اس میں شنگرف ہے "، کبھی کبھی میں بات کہنے کے لیئے پوچھ لیتا ۔

اس میں شنگرف ہے ؟ کیا سچ مچ اس میں شنگرف ہے ؟"

" ہاں ! ہاں !!

" ہاں ! ہاں !! کیا "، میں پوچھتا ۔

ہاں ہاں شنگرف ؟"

ہاں ہاں شنگرف کیا شنگرف سے ملتا جلتا کسی اور قسم کا شنگرف ہوتا ہے ؟

" شنگرف ، شنگرف ، شنگرف "! استاذی مکرم فی فی پی پا نے چیخ کر جواب دیا اور ساتھ ہی زمین سے ایک پتھر اٹھا لیا ۔

میں مسکرانے لگا۔ پھر فی فی پا بھی مسکرانے لگا ۔ دراصل جاپانیوں کی فکاہی حس بہت تیز ہوتی ہے ۔ اکثر اسی حس سے مغلوب ہو کر وہ خودکشی بھی کر لیتے ہیں جاپان میں اس قسم کی خودکشیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں ۔ جاپانی زبان میں اسے " ہار اکیری "، کہتے ہیں ۔

تو ــــ لیکن ــــ میں کیا کہہ رہا تھا ۔ کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے ۔ اور اسی وجہ سے میں اپنے جاپان کے سفر کے حالات جلد قلمبند کر دینا چاہتا ہوں ۔ کیونکہ کئی بار ایسا ہوا ہے ۔ کہ میں احباب کو جاپان کے حالات سناتے بیٹھا ۔ لیکن انگلستان کے لوگوں اور ان کی تہذیب و تمدن اور معاشرتی حالات بیان کرنے شروع کر دیئے ۔ جن سے اکثر اوقات میرے بیانات میں ایک عجیب تضاد سا پیدا ہو جاتا ہے جس سے کئی لوگوں کو بالخصوص ان تمام احباب کو جو میری طرح سچائی اور عدم تشدد پر یقین

رکھتے ہیں ۔ روحانی کوفت ہوتی ہے ۔ لیکن امید ہے ۔ کہ اب اُن تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا ۔

جاپان پہنچ کر سب سے عجیب بات جو میں نے دیکھی وہ جاپانی عورت تھی (اکثر لوگوں کا یہ خیال کہ جاپان میں عورتیں نہیں ہوتیں ۔ بالکل غلط ہے) جاپانی عورتیں نہایت دلیر، قوی الجثہ اور جفاکش ہوتی ہیں ۔ وہ اپنے وطن کے نام پر جان چھڑکتی ہیں ۔ اپنی جان تو الگ رہی ۔ وہ اپنے بیٹوں اور خاوندوں کی جانیں چھڑکنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں اس لحاظ سے وہ ہندوستانی ماؤں کی طرح عقلمند نہیں ۔ جو اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی نہیں ہونے دیتیں ۔ مبادا اُنہیں گولی نہ لگ جائے ۔ دراصل جاپانی عورت کو اپنے خاوند اور بچوں سے ذرا بھی محبت نہیں ہوتی ۔

جاپانی عورت ایک ڈھیلا ڈھالا "کمونو" پہنتی ہے ۔ جو کشمیری چوغے کی نقل ہے وہ گھر کا سب کام کاج کرتی ہے اور پھر کسی دکان یا کارخانے میں ملازمت بھی کر لیتی ہے تاکہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہو ۔ میں ٹوکیو میں کوئی پندرہ دن پر جی ہی ہو کے ہاں رہا ۔ اُن کی بیوی صبح نو بجے ہی گھر کے سب کام کاج سے فارغ ہو کر اسا ہیوں رستوران میں چلی جاتی تھی ۔ جہاں وہ چھ گھنٹے ویٹرس کے فرائض سرانجام دیتی تھی ۔ اور چار بجے واپس گھر چلی آتی تھی ۔ اور پھر چائے وغیرہ پی کر ایک دو گھڑی آرام کرنے کے بعد گھر کے دھندوں میں مصروف ہو جاتی تھی ۔ اس قسم کی مثالیں امرا اور متوسط طبقے میں عام ہیں ۔ جاپانی عورتیں اپنے گھر سے باہر کام کرتے میں ذرا نہیں ہچکچاتیں اور میں تو یہ بلا تامل کہوں گا ۔ کہ ہماری ہندوستانی عورتیں تو شرم و حیا کی پتلیاں ہیں ۔ اور جاپانی عورتیں تو اُن کے مقابلے میں بالکل گنوار اور بدتہذیب معلوم ہوتی ہیں ۔

خدا ہمارے ملک کو اس جاپانی تہذیب سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین ثم آمین۔

جاپان والوں کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ وہ یا تو بدھ مت کے پیرو ہیں، جو ہندوستان سے گیا ہے۔ یا شانتو مت کے جو مشہور چینی مصلح کینفوشس کے جاری کئے ہوئے مذہب کی نقل ہے۔ عیسائیوں کے گرجے ہیں۔ آریہ سماج کا ایک مندر ہے۔ چند مسجدیں بھی ہیں۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ جاپان کے لوگوں کو مذہب سے وہ لگاؤ نہیں، جو ہونا چاہیئے۔ جاپان میں "روحانیت" کی بہت کمی ہے۔ میں بہت سے جاپانی دوستوں سے ملاقات کی، وہ بھی اس کمی کو محسوس کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ اگر ہندوستان سے چند مبلغ اور پرچارک لوگ یہاں آئیں۔ تو یہ کمی جلد پوری ہو سکتی ہے۔ یہاں میں اس سلسلہ میں اُن تمام لوگوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں۔ جو جاپان کو سچے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان ابد الاباد سے روحانیت کا مرکز رہا ہے، اور رہے گا۔ کیا یہاں سے چند ایسے جوان نہیں نکل سکتے جو جاپان کو سیدھے راستے پر لگانے کے لئے اپنی جانیں وقف کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ بہت سے صحیح الدماغ لوگ میری آواز پر لبیک کہیں گے۔ اور جاپان کو لا مذہبیت کے بحرِ بیکراں میں ڈوبنے سے بچائیں گے۔

جاپان والوں کی اپنی کوئی زبان نہیں، جاپانی زبان دراصل چینی زبان ہی کی ایک شکل ہے اور حروف تہجی تو بالکل وہی ہیں اس کے علاوہ جاپانی اسکولوں میں انگریزی بھی ایک ضروری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر جاپانی انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے۔ وہاں سے بہت سے انگریزی اخبار نکلتے ہیں۔ جن کی تعداد کئی ہزار تک

پہنچتی ہے ۔

جاپان والوں کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ۔کوئی کلچر نہیں ۔کوئی ایسا نیا یا پرانا عقیدہ نہیں ۔جسے وہ ہم ہندوستانیوں کی طرح دنیا کے سامنے پیش کر سکیں ۔وہ محض نقل کرنا جانتے ہیں ۔اس معاملہ میں خود داری انہیں چھو تک نہیں گئی ۔چین سے ہندوستان سے ،مغربی ممالک سے ،جہاں سے بھی انہیں کوئی چیز پسند آگئی ،اُنہوں نے اُسے جھٹ اپنا لیا ۔اور اپنے نظام زندگی میں داخل کر لیا ۔وہ بہت جلد باز اور عجلت پسند ہیں ۔ہم ہندوستانیوں کی سی سُوجھ بُوجھ ان میں نہیں پائی جاتی ۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ صرف جاپان کی برائیاں ہی میرے پیشِ نظر ہیں ۔اب وہاں کی مفید اور دلچسپ باتیں سُنئے ۔جاپان میں امیروں اور غریبوں کے درمیان وہ شدید سماجی اور اقتصادی امتیاز نہیں ۔جو دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے ۔مثال کے طور پر جاپان کے وزیرِ اعظم کی تنخواہ ہندوستان کے ایک ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے زیادہ نہیں ۔لیکن اس کے جواز میں یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ ہندوستان جاپان سے بہت بڑا ملک ہے ۔کم از کم رقبے کے لحاظ سے اور ہاں بلحاظ آبادی بھی اس لئے یہاں لازمی طور پر تنخواہ زیادہ ہونی چاہیئے ۔بیشک ،بیشک ،میں تو اس امر کو بالکل بھول گیا ۔دیکھئے نا میرا حافظہ کس قدر کمزور ہے ۔

ایک بات مجھے جاپان میں پسند آئی ۔اور وہ جاپانی گے شاؤں کا اخلاق وہ عام طور پر ہندوستانی مغنیوں کی طرح بازو ہلا ہلا کر نہیں گاتیں وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں ۔اُن کی آواز سریلی ،اُن کے ترانے درد ناک اور لہجہ پُرسوز ہوتا ہے لیکن ایک موقعہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔میں ان دونوں شہر کوبے ٹا میں مقیم تھا ۔

جو مشہور آبنائے باسفورس کے مغربی درّے پر واقع ہے اور تجارتی مستقر بھی ہے، وہاں میری ملاقات جاپان کی مشہور گیشا تنری جی جی چی لی لا سے ہوئی۔ رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی تھی اور اُن کے مہمان خانے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور اُن کا گانا سُن رہے تھے۔ وہ گیت اس قدر پاکیزہ تھا۔ اور لَے اس قدر میٹھی اور پُرسوز کہ میں بے اختیار رونے لگا۔ یکایک تنری جی جی چی لی لا نے گانا بند کر دیا۔ اور حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔ اب میں نے دیکھا کہ اور معزز جاپانی مہمان بھی غصّہ میں بھرے ہوئے میری طرف تک رہے ہیں۔ میں نے معذرت چاہی۔ تو مجھے بتایا گیا۔ کہ میں نے جاپانی آرٹ کی زبردست توہین کی ہے۔ دراصل وہ گانا جو تنری جی جی چی لی لا گا رہی تھیں۔ آج سے دو ہزار سال پہلے جاپان کے مشہور ظریف شاعر ہوہو ہی ہما نے تیار کیا تھا۔ اور جاپان کے بہترین مزاحیہ گیتوں میں سے تھا۔ اُف کس قدر بھول ہوئی۔ اب بھی جب کبھی وہ جاپانی گیت میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگتا ہے، میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں۔ لیکن میں جاپانی آرٹ کی توہین کا خیال آتے ہی اُنہیں روک لیتا ہوں۔

جاپانی لوگوں کو پھولوں سے عشق ہے۔ میرا خیال ہے کہ جاپانی لوگ پھولوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ پہاڑوں پر، میدانوں میں، کھیتوں میں، سڑکوں کے کنارے باغیچوں میں۔ جہاں جاؤ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، خاصکر "چیری کا شگوفہ" تو جاپان کا "بہترین تحفہ" ہے۔ یہ صرف دن کو کھلتا ہے اور رات کو ایک کلی کی طرح بند ہو جاتا ہے۔ اور جب پھول مرجھا جاتے ہیں، تو اس کی بیل میں ایک قسم کا پھل لگتا ہے۔ اُسے "چی کو" کہتے ہیں۔ اس کا گودا بہت مزیدار ہوتا ہے۔ اسکی گٹھلی سے

بٹن اور کنگھیاں بنتی ہیں۔ اور اس کا چھلکا سُرخ رنگ بنانے کے کام آتا ہے اور جب اس کی بیل سوکھ جاتی ہے۔ تو جاپانی کارخانے اس کی جڑ کو سکھا کر اس سے ایک خاص دوا تیار کرتے ہیں۔ جو سنا ہے ہندوستان میں بہت بکتی ہے اور غیر ممالک مثلاً افریقہ، ٹانگانیکا، فجی وغیرہ میں بھی جہاں ہندوستانی آباد ہیں۔ خوب بھیجی جاتی ہے۔

غرض جاپانیوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ یہاں تک کہ کارخانوں میں بھی ہر مزدور کے قریب ایک پھولوں کا گملہ رکھا جاتا ہے۔ جب بیچارا مزدور ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد اضمحلال محسوس کرتا ہے۔ تو جھٹ ان پھولوں کو سونگھنے لگتا ہے اس سے اس کے تن بدن میں ایک نئی روح دوڑ جاتی ہے اور وہ پھر زیادہ تن دہی سے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کاش ہمارے ہندوستانی کارخانہ دار بھی ان جاپانی کارخانہ داروں کی تقلید کریں۔

جاپانی پھولوں کے ذکر سے خود بخود جاپانی شاعروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی رسالوں میں جاپانی شاعروں کے تذکرے پڑھ پڑھ کر انہیں دیکھنے اور ان سے ملاقات کرنے کا شوق میرے دل میں جاپان جانے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا۔ کہ جاپان میں کسی شاعر کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں تو مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ جاپان میں از روئے قانون شعر کہنا منع ہے۔ جاپان کا آخری شاعر ڈوڈواوے کا تھا جسے پانچ سو سال قبل از مسیح میکاڈو کے مقدس حکم سے سنگسار کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ جاپانیوں کے اپنے ملک میں کوئی شاعر نہیں۔ تاہم وہ دوسرے ملکوں کے

شاعروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان کے شاعروں کے لئے اُن
دل میں بہت احترام ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ ہر ایک قوم کو اپنا اپنا کام کرنا چاہیئے۔
کوئی قوم ملک فتح کرتی ہے۔ کوئی صرف شاعر پیدا کرتی ہے۔ دونوں اپنی
اپنی جگہ رہیں۔ تو بہتر ہوگا"

اور یہی پیغام ہے۔ جو میں آپ کے لئے جاپان سے لایا ہوں۔ اور یہی وہ آخری
الفاظ تھے۔ جو علامہ غوغوعین تے جو جاپان میں امورِ خارجہ کے بہترین ماہر سمجھے
جاتے ہیں مجھے جہاز پر رخصت کے وقت کہے۔

ہاں ایک بات رہ گئی۔ اور وہ یہ کہ میں جاپان کب اور کن حالات میں
گیا۔ تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ایک دن جب میں مشہور سیاسی کتاب

"Japan must Fight Britain"

یعنی "جاپان برطانیہ سے ضرور لڑے گا" پڑھ رہا تھا تو یکایک میری آنکھیں
جھپک گئیں اور ـــــ اور ـــــ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں جاپان
ضرور گیا تھا۔

باون ہاتھی

مجھے اب بھی طرح یاد ہے کہ تری پوری کے مقام پر ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگرس نے نہایت فخر سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ کانگرس کے صدر کا جلوس باون ہاتھیوں پر نکالا جائے۔ خدا کی خلقت پیدل چلے گی۔ لیکن کانگرس کے صدر کی گاڑی میں باون ہاتھی جوتے جائیں گے۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس سے پچھلے سال کانگرس کے صدر کا جلوس ایک بیل گاڑی اور بارہ بیلوں پر نکالا گیا تھا۔ انہی مثالوں کو دیکھتے ہوئے میں نے ملک کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے۔ کہ امسال صدر کے جلوس میں ایک بگہ گاڑی اور چند بکریاں شامل کی جائیں۔ تاکہ اُس قرونِ وسطےٰ کی تہذیب کہ جس کا احیا ہمارے رہنما چاہتے ہیں دوبارہ زندہ ہو سکے۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مجھے ہاتھیوں سے نفرت ہے۔ ہاتھی ایک بہت بڑا جانور ہے۔ اور اُس زمانے کی مخلوق ہے۔ کہ جب الہٰی قدرت کے تخیل میں انسان کا وجود بھی

نگھڑا گیا تھا۔ اس لئے ہاتھی بنی نوع آدم کا بزرگ ہے اور میں اس کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں، کہ جتنی میں اپنے اُن بزرگوں کی عزت کرتا ہوں جنہیں اِس دنیا میں مجھ سے پہلے پیدا ہوتے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ہاتھی میں کئی خوبیاں ہیں خاص کر مجھے وہ منظر بہت دل کش معلوم ہوتا ہے جب میں کسی ہاتھی کو کسی ندی کے درمیان کھڑا ہو کر اپنی لمبی سونڈ سے پانی کو فوارے کی طرح اچھالتا دیکھتا ہوں۔ اس لحاظ سے ہاتھی قدرت کا شالامار باغ ہے، اور آگ بجھانے والا آلہ بھی۔ پچھلے وقتوں میں جب شہروں میں آگ بجھانے والی مشینیں نہ ہوتی تھیں بڑے بڑے مہاراجے اور بادشاہ اپنے ہاتھیوں کی سونڈوں سے بازاروں اور محلوں میں آگ بجھانے کا کام لیا کرتے تھے، اور اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری اس تحریر کا یہ اثر نہ ہو کہ ہندوستان کی میونسپل کمیٹیاں آگ بجھانے کی برقی مشینیں ترک کر کے ہاتھی پالنا شروع کر دیں اور گڈا اور چرخہ کے ساتھ ساتھ ہاتھی بھی پرانی تہذیب و تمدن کا مظہر بن جائے۔

ہم ہاتھی کو قرونِ وسطیٰ کے تمدن کا ایک خوبصورت نشان سمجھ کر اُسے آثارِ قدیمہ میں شامل کر سکتے ہیں۔ زندگی کے ارتقاء کے نظریئے کے ماتحت اُسے قدرت کے مشہور عجائبات میں شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن جس چیز پر مجھے اعتراض ہے، وہ ہے ہاتھی کو آمد و رفت کا ذریعہ بنانا، ہاتھی فی الحقیقت سواری کا جانور نہیں ہے۔ ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کسی کوہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھنا۔ میں اس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ جب میں آخری بار ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ راجہ صاحب کا ہاتھی تھا اور ہاتھی کی پیٹھ پر چاندی

کا ہو وہ کیسا تھا۔ بیچارے راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور ہم سب لوگ ایک ماتمی جلوس کی شکل میں شمشان گھاٹ کو جا رہے تھے۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کیونکہ ریاستوں میں ماتمی جلوس بھی اتنے ہی پُرشکوہ ہوتے ہیں، کہ جتنے شادیوں کے جلوس، نفریاں اور ڈھول بج رہے تھے، ہاتھی اور علم برادر سجے ہوئے تھے، سنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ اور ریاستی بینڈ بج رہا تھا۔ ہم چاندی کے ہودے میں بصد فخر و امتیاز بیٹھے ہوئے نیچے زمین پر چلنے والی رعیّت کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس طرح بین کر رہی تھی جیسے سچ مچ اُن کا گھر اجڑ گیا ہو۔ ہاتھی کی خفیف سی حرکت بھی ہودے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ تبدیل کر دینے پر مجبور کر دیتی۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ کے سفر کے بعد حالت یہ ہو گئی۔ کہ جو شخص ہودے میں سب سے آگے بیٹھا تھا اب سب سے پیچھے لڑھک گیا تھا۔ غالباً سب سے محفوظ جگہ وہ تھی۔ جہاں مہاوت خود بیٹھا ہوا تھا۔ دھت، دھت، ہیری، ہیری، مہاوت آرام سے بیٹھا ہوا حکم دیئے جاتا تھا۔ اور ہمارے شانے ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر چھلنی ہوئے جا رہے تھے، ہڈیاں ٹوٹنے کو تھیں۔ اور پیٹ کا پانی اچھل کر گلے تک آ پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ ارتھی شمشان گھاٹ کی طرف چلی جہاں چتا تیار کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر لوگ اِدھر اُدھر گھومنے لگے اور مجمع بکھر گیا۔ یہاں پہنچ کر ہاتھیوں کی چال بھی تیز ہو گئی۔ یکایک ہمارے ہاتھی نے ایک چیخ ماری اور دریا کی طرف دوڑا۔ یہ دیکھ کر لوگ خوف سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کسی نے دریا میں چھلانگ لگائی تو کوئی سرکنڈوں میں جا پھنسا۔ کئی لوگ ارتھی کو چھوڑ کر بھاگ گئے، مہاوت نے ہاتھی کو قابو میں لانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ کوہِ آتش فشاں کو اب قابو میں لانا بہت مشکل تھا۔ ہاتھی نے سر کو

ایک زور سے جھٹکا دیا۔ اور غریب جھاوت زمین پر گر پڑا۔ اور ہاتھی نے اُسے سونڈ سے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے پاؤں تلے بھی روند سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے اس نے کیوں اُس جھاوت کی جان بخشی کر دی۔ جو ہر لمحہ پیر تسمہ پا کی طرح اُس کے سر پر سوار رہتا تھا۔

یہاں سے ہاتھی خوشی سے چیخیں مارتا ہوا دریا میں گھس گیا، دریا کو پار کر کے دھان کے کھیتوں میں گزرتا ہوا بلا خوف و خطر ایک چھوٹی سی گھاٹی پر چڑھ گیا۔ یہاں پہنچکر اُس نے لمبے لمبے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ شائد وہ صدیوں تک اسی طرح لمبے لمبے چکر کاٹتا رہا۔ اور مسرت سے چیختا رہا۔ شمشان گھاٹ ہم سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور اس پاگل ہاتھی کے ہودے میں گویا ہم ہر لحظہ موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ لیکن کوئی فرد بھی ہماری مدد کو نہ پہنچا تھا۔ کون ایسا دلیر آدمی تھا۔ جو ایک پاگل ہاتھی کے ہودے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی مدد کر سکتا، بہت دیر کے بعد گویا صدیوں کے عرصہ کے بعد ہاتھی کی چال مدھم پڑ گئی۔ شاید جوش سرد پڑ رہا تھا۔ آزادی کی خواہش معدوم ہو رہی تھی۔ اُس کے چکر چھوٹے ہونے گئے۔ اور آخر وہ ایک جگہ پر بالکل رُک گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا۔ اور گھاٹی سے نیچے اترنے لگا۔ گھاٹی سے اُتر کر اُس نے دھان کے کھیتوں کو پار کیا۔ اور پھر واپس دریا میں گھسا اور سرکنڈوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا پھر واپس شمشان گھاٹ میں پہنچا۔ اس عرصہ میں لوگوں نے اپنی دانست میں ہمیں مردہ سمجھ لیا تھا۔ اور اب وہ نہایت دلجمعی سے ہمارے لئے بھی چتا تیار کر رہے تھے۔ یکایک ہاتھی کو دوبارہ واپس آتے ہوئے اور ہمیں ہودے میں زندہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ سوائے جھاوت کے اور کوئی شخص ہمیں

خوش آمدید کہنے کے لئے آگے نہ بڑھا۔ مہاوت بھی رُکتے رُکتے قدموں سے قریب آیا۔ لیکن ہاتھی اب سر جھکا کر چپکا کھڑا تھا۔ جیسے اپنے طرزِ عمل پر خود ہی نادم ہو۔ مہاوت اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے پچکارنے لگا۔ اور اُسے پیارے پیارے ناموں سے بلانے لگا۔ میری پیاری مینا۔ سندر مینا تم کتنے شریر ہو۔ واہ کیا شرارت ہے ہماری تو ہودے میں ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ اور آپ کیا مزے سے فرماتے ہیں۔ سندر مینا تم کتنے شریر ہو۔ اگر کسی کو جان سے مار دینے کی کوشش محض ایک شرارت سمجھی جا سکتی ہے۔ تو میں اپنے ملک کے رہنماؤں سے درخواست کرونگا کہ وہ اس ہاتھی کی شرارت کا خیال رکھیں۔ ریاستی دنیا میں شاید انسان کی زندگی اس قدر سستی نہیں ہے۔ کہ اُسے ہاتھی کی ایک معصوم شرارت پر قربان کر دیا جا سکے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہاتھی بطور ایک ذریعۂ آمد و رفت ایک ناکارہ شے ہے سست رفتار بھی ہے۔ اور غیر عمومی undemocratic بھی، ہندوستان کے اکثر رہنماؤں کی طرح ہاتھی کا جسم بڑا اور دماغ بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اُسے یہ پتہ نہیں ہوتا۔ کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں کی طرح وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اندھیرے میں پاتا ہے۔ اور روشنی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن آجاتی ہے۔ لیکن پھر جس سرعت سے روشنی اندر آتی ہے اُسی سرعت سے واپس چلی جاتی ہے اور دماغ کو بدستور تنگ و تاریک چھوڑ جاتی ہے۔ اور ہاتھی بے چارہ یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اور کیوں؟ اور بیچارے مہاوتوں اور آدمیوں کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اب ہاتھی کیا کریگا اور کب؟

پنجاب کا مہاراجہ جے پال محمود غزنوی سے مارا گیا۔ اور پورس نے سکندر اعظم سے شکست کھائی۔ اس لئے نہیں کہ ہندوستانی دلیر اور بہادر نہ تھے یا کہ وہ فوجی اور غیر فوجی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے شکست کھائی تو اس لئے کہ ان ہاتھیوں نے انہیں دغا دی بجائے اس کے کہ یہ ہاتھی ترکوں اور یونانیوں کا مقابلہ کرتے اور آگے بڑھ کر انہیں کچل ڈالتے۔ انہوں نے اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اپنے ہی ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے پاؤں تلے روندا۔ اور ان کی صف بندیوں کو تحس نحس کر دیا۔ ہندوستان کی غلامی کی تواریخ ہاتھیوں کی غداری کی تواریخ ہے۔ نہ کہ میر جعفر اور جے چند کی غداری کی تواریخ۔ کاش ہمارے ملک کے رہنما تواریخ سے کچھ سبق سیکھ سکتے۔ انہوں نے اپنے جلوسوں میں ایک نہیں بلکہ باون ہاتھی استعمال کرنا شروع کئے ہیں۔ اس کا نتیجہ ملک کے حق میں اچھا نہیں ہو سکتا۔

آخر میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہاتھی "تشدد" کا حامی ہے۔ یا "عدم تشدد" کا۔ وہ "سچائی" پسند کرتا ہے یا "فریب"۔ تو اس کے متعلق بھی میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جہاں تک میں نے ہاتھی کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے وہ ایک خدا پرست جانور ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اُسے ایک الہٰی اشارہ سمجھنا چاہیئے۔ اور مجھے تو وہ الہٰی اشارہ کبھی نہیں بھولتا۔ جب اُس نے دریا کے پار ایک بلند گھاٹی پر چند چکر دے کر مجھے ذہن نشین کرا دیا تھا کہ مالِ ہستی محض ایک فریب ہے۔ اس لحاظ سے ہاتھی ایک صوفی ہے۔ وہ ایک مہاتما ہے جو لنگوٹی سے بھی ناآشنا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ باون ہاتھی جو کانگرس کے صدر کی گاڑی میں جوتے گئے تھے۔ اُسی الہٰی اشارے کے زیر اثر اُسے نربدا میں گھسیٹ

ے جاتے تو کیا ہوتا ۔ کیا ہندوستان کی تواریخ بدل جاتی ۔ اے کاش یوں ہوتا یوں نہ ہوتا ۔ لیکن ان باتوں کو بے کار سوچنے سے کیا حاصل حقیقت یہی ہے کہ جب تک ہندوستان میں گرو ۔ پچر تھا اور ہاتھی کا اقتدار رہیگا ۔ یہ بدنصیب ملک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا ::

سوراج سے پچاس سال کے بعد

(سنہ ۱۹۹۷ء میں ایک ہندوستانی نوجوان، جس کے آباؤ اجداد سوراج کے بہت عرصہ پہلے برازیل کے ملک میں آبادکاروں کی حیثیت سے مقیم ہو چکے تھے واپس اپنے وطن کو آیا۔ ڈیڑھ دو سال کی سیاحت کے بعد وہ پھر برازیل چلا گیا۔ وہاں پہنچکر اس نے ایک کتاب لکھی، سوراج سے پچاس سال کے بعد، اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے لیکن ہندوستان میں اس کی اشاعت ممنوع ہے، ذیل کا مضمون اسی کتاب میں سے لیا گیا ہے)

جب ہمارا جہاز پٹیل پورٹ (جسے انگریزوں کے عہدِ حکومت میں بمبئی کہتے تھے) کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ تو میرے دل میں مسرتوں اور امنگوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اپنے وطنِ عزیز کی درخشندہ جھلک نے میری روح پر ایک کپکپی سی طاری کر

دی ۔ اور وطنیت کے جذبات سے مغلوب ہو کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے لب بر ساحل سنگ مرمر کا بنا ہؤا ایک عالیشان دروازہ تھا۔ جس کے اوپر دس جھنڈے لہرا رہے تھے ۔ ترنگا جھنڈا سبز رنگ کا جھنڈا، سفید جھنڈا، کیسری جھنڈا غرضیکہ رنگا رنگ کے جھنڈے تھے ۔ اور یہ سب کے سب قومی جھنڈے متصور کئے جاتے ہیں۔

سیاہ رنگ کے جھنڈے کو دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی ۔ کیونکہ برازیل اور دیگر ملکوں میں اسے "سوگ کی نشانی" سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن بعد میں مجھے بتایا گیا۔ کہ یہ شہیدوں کا قومی جھنڈا ہے ۔ جنہوں نے اپنے وطن کی خاطر بھوک ہڑتال کرتے ہوئے جان دی ۔ ایک اور جھنڈا بھی تھا ۔ جس پر کنول کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ بنگالیوں کا جھنڈا تھا ۔ دراصل سوراج ، ملنے کے بعد ہی ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ میں قومی جھنڈے اور زبان کے مسئلہ پر ایک زبردست بحث چھڑ گئی تھی اور عین ممکن تھا کہ یہ بحث ایک خطرناک خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتی ۔ لیکن ہندوستان کے مقتدر رہنماؤں نے باہمی مفاہمت سے اس کا حل تلاش کر لیا تھا ۔ چنانچہ اس وقت سے یہ کہ اب ہر ہندوستانی کو اجازت تھی ۔ کہ وہ اپنا قومی جھنڈا اپنی مرضی کے مطابق بنا لے ۔ اور جس زبان کو چاہے اختیار کرے ۔ اس امر کا ایک نتیجہ یہ ہؤا تھا ۔ کہ کئی لوگ عدالت میں ایک کاغذ کے پرزہ پر محض آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر لے جاتے تھے ۔ اور حاکم کو اس نئی زبان اور تحریر پر غور کرنا پڑتا تھا ۔ لیکن جیسا میں آگے چل کر بتاؤں گا ۔ یہ محض فروعی باتیں تھیں ۔ اور اس کا ملک کے نظم و نسق اور تہذیب و تمدن پر مطلق کوئی اثر نہ تھا ۔

دروازے کے باہر ایک آدمی اپنے سامنے قلم، دوات اور "بہی" رکھے ہوئے ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا ٹوپ اتار کر اُسے سلام کیا۔ اُس نے چند لمحے میری جانب گھور کر دیکھا۔ پھر بولا۔

تم کہاں سے آئے ہو۔

برازیل سے۔ یہ میرا پاسپورٹ ہے۔

ہُم . . . . تم ہندوستانی ہو۔

جی ہاں۔ میں نے فخر سے جواب دیا۔

تم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہتے ہو؟

کتنا عجیب سوال تھا۔ میں نے کہا میں ہندوستانی ہوں۔ اور ہندوستان میں ٹھہرنے کا مجھے پورا پورا حق ہے۔ چاہے چھ مہینہ رہوں۔ چاہے عمر یہیں گزار دوں۔

ہُم . . . یہ بات نہیں، تم نے اور تمہارے ماں باپ نے اپنی ساری عمر ہندوستان سے باہر بسر کی ہے، تم ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔ تم یہاں چھ مہینہ کے لئے ٹھہر سکتے ہو۔ اس نے پاسپورٹ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ٹھہرنے کے لئے تمہیں پٹیل پور کے حاکمِ اعلیٰ کی اجازت حاصل کرنا ہوگی۔

میں نے احتجاجاً کہا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ یہ میرا پیدائشی حق ہے۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔ ہر ہندوستانی، ہندوستانی نہیں ہو سکتا۔ کیا تم چرخہ چلانا جانتے ہو۔

نہیں۔

تکلی پھیرنا؟

نہیں

سُوت کی انٹی چڑھاتا

نہیں۔

کھڈی کا تانا بُنتا؟

نہیں

اُس نے طنزاً کہا۔ اور تم اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہو۔ مجھے ہر روز تمہارے جیسے چالاک آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جو یہاں بدیشی ملکوں سے سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ ہوں۔۔۔ اچھا مجھے بتاؤ کیا تم نے کبھی اپنے ہاتھ سے اپنا کھانا بنایا ہے۔

"نہیں"

"گڑ کھاتے ہو۔

"نہیں۔ ہمارے برازیل میں گڑ نہیں ہوتا"

برازیل میں گڑ نہیں ہوتا؟ اُس نے چیخ کر کہا "آہ۔ کیسا وحشی اور غیر متمدن ہوگا وہ ملک"

وہ سوالات کرتا جاتا تھا۔ اور میرے جوابات اُسی بہی میں درج کرتا تھا۔ پھر پوچھنے لگا۔ کیا تم اپنا بول و براز اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہو۔

اب چیخنے کی میری باری تھی۔ کبھی نہیں؟ ہرگز نہیں؟۔۔۔ شاید ایک دو بار۔۔۔۔ جب میں بچہ تھا۔

میں بچپن کی بات نہیں کرتا۔ اُس نے بہی میں لکھتے ہوئے کہا۔ بچپن میں

ہر شخص ہندوستانی ہوتا ہے۔

میں ان عجیب و غریب سوالات سے تنگ آ گیا تھا۔ اور اس سڑی شخص سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری طرف پھر گھورنے لگا۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کرو اور اس دروازے کے اندر جانے دو۔"

اُس نے کہا۔ اچھا تم خدا پر یقین رکھتے ہو یہ ایک بات تمہارے حق میں ہے اُس نے یہ امر بھی میں نوٹ کر لیا۔ پھر بولا "تم شراب پیتے ہو؟

میں نے کہا "ہاں۔ ہمارے ملک میں عام دستور ہے اسے پیئے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

کھانا؟ اس نے کہا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تم کھانا زمین پر بیٹھ کر کھاتے ہو۔ یا میز پر بیٹھ کر۔

میز پر بیٹھ کر۔ چھری کانٹوں کے ساتھ۔

ہم . . . چھری کانٹوں کے ساتھ! اس نے لکھتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ اپنا سامان دکھاؤ۔

معمولی سا سامان تھا۔ اس نے چند منٹوں میں دیکھ لیا۔ ایک سوٹ کیس کے کونے میں اُسے چند چھریاں کانٹے مل گئے۔ اُس نے اُنہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا "یہ قانون عدمِ تشدد کی زد میں آتے ہیں"۔

اب تم جا سکتے ہو! اُس نے کہا۔

جس ہندوستان کا حال میرا دادا مجھے سنایا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان نہ جانے اب کہاں ناپید ہو گیا تھا۔ میرے دادا اشتراکی تھے۔ اور سوراج کے بہت

عرصہ پہلے اپنے وطن سے جلاوطن ہو چکے تھے۔ انہیں اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی آشنا آخری دم تک ستاتی رہی۔ میرے والد تو خیر شروع سے غیر سیاسی مزاج رکھتے ہیں۔ انہیں سیاست کے بجائے زراعت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے انہوں نے کبھی ہندوستان آنے کی تمنا نہیں کی۔ لیکن جب مجھے ہندوستان دیکھنے کا متمنی دیکھا تو کہنے لگے۔ اچھا بیٹی۔ جاؤ اپنے وطن عزیز کی زیارت کر آؤ۔ مگر میں نے سنا ہے کہ ملک بدل چکا ہے۔ بہت "، وہاں تم اجنبی سے محسوس کرو گے بابا

اجنبیت! میں حیران ہوں کہ موجودہ حالات کا کس انداز میں تجزیہ کروں۔ یہ اتنا عجیب و غریب ملک ہے۔ دوسرے ممالک سے اتنا انوکھا اور الگ، کہ یسا او قات حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی ہندوستان ہے کہ جس کے متعلق میرے دادا جان اتنی دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے۔ اور جس کے درخشندہ مستقبل کے متعلق اُن کی اتنی بڑی امیدیں تھیں۔

ہندوستان میں آکر سب سے عجیب بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اخبار کوئی نہ تھا۔ دراصل کاغذ بہت کم دستیاب ہوتا تھا۔ اور وہ بھی ہاتھ کا بنا ہوا سیالکوٹی کاغذ جو عدالتوں اور دیگر سرکاری محکموں کے لئے بھی ناکافی ہوتا تھا۔ اور اکثر کئی مقدمات کا فیصلہ اسی لئے مہینوں تک رکا رہتا تھا کہ جج کے پاس فیصلہ لکھنے کے لئے کاغذ موجود نہ تھا۔ غریب مدرس بھوج پتر اور کیلے کے پتوں پر کتابیں لکھتے تھے اور طلبا انہیں زبانی حفظ کر لیتے تھے۔ صرف چند ایک رسائل از قسم شیرازہ، ادبی دنیا ہمایوں وغیرہ باقی رہ گئے تھے۔ جو بیل اور

گور کے پتوں پر چھاپے جاتے تھے۔

ہندوستان میں آکر میں نے دیکھا کہ ہر شخص ایک ہی مذہب کا پجاری نہیں ہے۔ میرے دادا مذہب کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے ——— کہ ہندوستان کو سوراج اس لئے حاصل نہیں ہوتا۔ کہ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ غیر اقوام ہمیشہ ہمارے ملک پر قابض رہتی ہیں۔ لیکن جب ملک کے سب سے بڑے مہاتما نے اپنی روحانی طاقت کے بل پر سوراج حاصل کیا تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملک میں ماسوائے مہاتما کی روحانیت کے باقی سب مذہب مٹ گئے یہ ایک ایسا فوق الفطرت اور نادرالوقوع کارنامہ تھا۔ کہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے غفار آباد (جسے پہلے پشاور کہتے تھے) میں ایک بوڑھے آدمی سے استفسار کیا۔ جو حسن اتفاق سے میرے دادا جان کا واقف نکل آیا۔ تو اُس نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے سارا حال یوں بیان کیا۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان کو سوراج حاصل ہوتے ہی عوام کے دلوں پر مہاتما کے فوق الفطرت اوتار ہونے پر پورا پورا یقین ہو گیا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا فقیر ہے۔ جس کی بات ٹالنا گناہ ہے۔ مہاتما کے بعد اس کے چیلوں نے (جنہیں ہم سردار کہتے ہیں) اس مت کو بہت فروغ دیا اور اب تو راس راجیدر سے کوہ کر پلاتی تک ہر شخص اس مت کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ دراصل جاپان کی طرح ہندوستان میں بھی یہ ایک وطنی مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اس ہندوستان میں نہ کوئی ہندو ہے۔ نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ جینی، نہ بدھ، بلکہ ہر شخص اپنے آپ کو

مہاتما کا بھگت کہلواتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے میں نے ہندوستان میں مندر، مسجد، گوردوارے کہیں نہیں دیکھے۔

آہ۔ آج اگر میرے دادا جان زندہ ہوتے تو اس منظر کو دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ دیہاتوں میں شہروں میں جگہ جگہ ان مندروں اور مسجدوں اور گوردواروں کے بجائے عالیشان عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں چرخہ گاہ کہا جاتا تھا۔ ان کے اندر صبح و شام زائرین کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا چرخہ گاہ کے عین وسط میں سونے یا چاندی یا کسی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا چرخہ نصب ہوتا جسے لوگ آکر باری باری گھماتے تھے۔ اور اپنی روح کو فیضان پہنچا کر واپس چلے جاتے زود الاعتقاد لوگ چرخہ گاہوں میں منتیں مانتے تھے۔ رتیاں دیتے تھے۔ چرخے کے پیر گنڈے اور تعویذ فروخت کرتے تھے۔ اور یہ تجارت بہت زوروں پر تھی جیسے ہمارے ہاں عیسائی عورتیں سونے اور چاندی کے خوشنما صلیب اپنے گلے میں باندھتی ہیں۔ اسی طرح میں نے اکثر ہندوستانی خواتین کو اپنی گردنوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت طلائی چرخے اور کانوں کے لئے بھی یہی چرخہ نما طلائی آویزے استعمال کرتے دیکھا ہے۔ اکثر چرخہ گاہوں میں چرخہ اور مہاتما کی مورتی ساتھ ساتھ ہوتیں۔ اور لوگ دونوں کی یکساں طور پر پوجا کرتے تھے۔ سکولوں اور کالجوں میں چرخہ چلانا نصاب تعلیم میں بطور ایک ضروری مضمون کے شامل تھا۔ سب سے اعلیٰ چرخہ چلانے والے کے لئے "چرخاگ"، کی ڈگری حاصل کرنا لازمی تھا۔ میں نے ایک چرخاگ کو دیکھا جو بہار یونیورسٹی میں سب سے اوّل رہا تھا۔ وہ سر کے بل الٹا ہو کر اپنے پاؤں سے چرخہ چلا سکتا تھا۔ اور میں نے سنا ہے۔ کہ ہندوستان میں کئی ایسے آدمی موجود ہیں جنہیں چرخہ

چلانے میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ اگر ان کے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیئے جائیں تو وہ محض آنکھوں کی پلکوں کی مدد سے چرخہ گھما لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کو عموماً چرخہ گاہوں کا پجاری یا صوبوں کا گورنر بنایا جاتا ہے۔

ذہنی اور سیاسی انقلاب سے بھی بڑھ کر ہندوستان میں غذائی انقلاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی پچھتر فی صدی آبادی بکری کا دودھ اور کھجوریں کھا کر گزارا کرتی ہے۔ اور جہاں بکری کا دودھ اور کھجوریں نہ دستیاب ہوں وہاں سنگترے کا رس پیا جاتا ہے اور اگر سنگترے بھی نہ ملیں۔ تو محض فاقے پر زندگی بسر کی جاتی ہے۔ اس غذائی انقلاب سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا۔ کہ ملک میں لڑائی جھگڑے قطعاً معدوم ہو گئے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ بکری کا دودھ متواتر ایک مہینہ پی لینے کے بعد لڑائی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ خودکشی کرنے کو ضرور چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں خودکشیوں کی تعداد پہلے سے سہ چند ہو گئی ہے۔ کسان لوگ گندم، مکئی، سرسوں وغیرہ کی کاشت نہیں کرتے بلکہ بکریاں پالتے ہیں۔ اور ہندوستان کے سب سے زیادہ آباد علاقے وہ ہیں جہاں کھجوریں بہت ہوتی ہیں۔ مثلاً راجپوتانہ، سندھ، اور دکن، کشمیر اور اس کے نواحی علاقوں میں جہاں نہ سنگترے ہوتے ہیں اور نہ کھجوریں، چند غیر مذہب کے قبائل آباد ہیں۔ جو یا تو فاقے کرتے ہیں یا کھٹے، سیب اور زرد آلوچے کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع ہے۔

ہر سوموار کو خاموشی کا دن منایا جاتا ہے۔ اس دن ہندوستان سارا خاموش رہتا ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنے دل کی

بات سمجھاتے ہیں۔ یا کاغذ پنسل کی مدد سے کام چلاتے ہیں۔ گھر کے پالتو جانور مثلاً کتے۔ بلی۔ طوطے۔ مینا۔ گھوڑے، گدھے، بیل، بکری، غرضیکہ ہر جانور کا منہ کسی کپڑے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ خاموشی میں خلل نہ ہو۔ اور "مون برت" کی تقدیس میں فرق نہ آئے۔

اپنے قیام کے دوران میں میں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی لوگوں کا عدم تشدد کے عقیدے پہ ایک ایسا پختہ ایمان ہے۔ جو کبھی متنزلزل نہیں کیا جاسکتا، یہ دلکش عقیدہ اب ان کی زندگی کا جزوِ اعظم بن چکا ہے۔ لیکن مجھے حیرانی تو اس امر سے ہوئی۔ کہ کس طرح اس بظاہر کمزور اور بودے عقیدے نے ہندوستان کے تمام مسائل حل کر دیئے تھے۔ جب میں نے اپنے داداجان کے بوڑھے دوست سے پوچھا۔ کہ یہ کس طرح ہُوا۔ کہ ہندو مسلمان ایک ہو گئے" اور وہ تیز قسم کے اشتراکی جو اس قسم کے سوراج کے سخت دشمن تھے۔ وہ کیسے اس عدم تشدد کی لپیٹ میں آکر اپنی ہستی فنا کر بیٹھے۔ تو اُس بزرگ خضر صورت نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کہ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ لیکن مختصر یوں سمجھو۔ کہ عدم تشدد نے انہیں فنا نہیں کیا۔ بلکہ وہ لوگ خود ہی فنا ہو گئے۔ بکری کا دودھ پی پی کر دو سال کے عرصے میں ہندو مسلمان کی تمیز خود بخود مٹ گئی۔ باقی رہ گئے اشتراکی۔ اُن سے ہم لوگوں نے عدم تعاون کر لیا۔ ہم نے ان لوگوں کو جان سے نہیں مارا۔ کیونکہ کسی کو جان سے مارنا عدم تشدد کے عقیدے کے خلاف ہے۔ ہاں ہم نے اتنا ضرور کیا۔ کہ ان زندگیوں سے سے عدم تعاون کر لیا۔ اور وہ بھی نہایت محبت اور پیار سے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

سیدھی سی بات ہے۔ ہم ہندوستانی جب کسی کی زندگی سے عدم تعاون کر لیتے ہیں۔ تو پھر ہم اُس سے کسی طرح کی بات چیت نہیں کرتے، نہ اُسے کہیں نوکری ملتی ہے، نہ بازار میں اُسے کوئی چیز مل سکتی ہے، نہ گھر پر، اُس کے چاروں طرف ایک خلاسی قائم کر دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی دنوں میں یا تو اُس کا مزاج درست ہو جاتی ہے۔ اور یا وہ شخص بھوکا پیاسا مر جاتا ہے۔ اسی عدم تعاون کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں اشتراکی مر گئے۔ اور آج کہیں ڈھونڈے سے بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔

لیکن یہ تو تشدّد ہے! میں نے بلند آواز میں کہا۔ صاف تشدد ہے اور کیا۔

اُس ایزرگ نے اِدھر اُدھر دیکھا کر کہا۔ آہستہ سے بات کرو۔ اگر کسی راہ چلتے نے سن لیا، تو ہماری زندگی سے بھی عدم تعاون کر دیا جائیگا۔ پھر وہ بلند آواز میں کہنے لگے۔ کیوں صاحب اس میں تشدد کیا ہے؟ ہم نے انہیں قید نہیں کیا۔ پھانسی نہیں دی۔ اُن کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی۔ ہم پر تشدد کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے فوج اور پولیس کو رکھنا ضروری نہیں خیال۔ اور دراصل اس ملک کی فضا میں یہ دونوں محکمے غیر ضروری سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے کسی کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ منصف اور وکیل سارا دن بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ اور تکلی پھیرتے رہتے ہیں۔

کبھی کوئی دنگا فساد نہیں ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے وقت دونوں ہاتھ جوڑ لیتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ اگر کسی سے کسی بات پر ناراضگی پیدا ہو جائے تو اُسے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ اپنی جان پر فاقہ کر کے اُس کا پراشچت (کفارہ) ادا کرتے ہیں۔ ملک میں کپڑے کے کارخانے مدت سے بند ہو چکے ہیں۔ اور ہاتھ کا بنا ہُوا کپڑا ساری آبادی کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے کروڑوں آدمی نیم برہنہ رہتے ہیں۔ لوگ عیش و آرام کو مطلق پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے گھروں سے کرسیاں، صوفے، گلدان، غالیچے، سب نکلوا کر جلا دیئے ہیں۔ یہ لوگ زمین پر سوتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور دن رات پرماتما کے دھیان میں لگن رہتے ہیں۔ بازاروں میں بکریاں ٹہل کرتی پھرتی ہیں۔ اور اپنے مالکوں کے لئے سودا سلف خرید کرے جاتی ہیں۔

عورتوں کی عزت و توقیر کے معاملے میں ہندوستانی سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہاں ہر عورت کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ گو رسمی طور پر شادیاں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا عورت کیا مرد ہر ہندوستانی فرد "برہمچریہ" کے اصول کا شیدائی نظر آتا ہے۔ محکمہ اعداد و شمار سے دریافت کرنے پر مجھے پتہ چلا۔ کہ پچھلے بیس سالوں میں سارے ہندوستان میں صرف چھ بچے پیدا ہوئے یہ چھ بچے برہمچریہ کے اصول کی شاندار کامیابی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر ہندوستان کے کل باشندے برہمچریہ کے اصول پر اسی سختی سے کاربند رہے۔ تو وہ دن دور نہیں۔ کہ جب سارے ہندوستان میں کوئی بچہ نہ پیدا ہو سکے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پچھلے تیس سالوں میں ہندوستان کی آبادی ایک

وہ کیسے ؟ میں نے پوچھا۔

سیدھی سی بات ہے۔ ہم ہندوستانی جب کسی کی زندگی سے عدم تعاون کر لیتے ہیں۔ تو پھر ہم اُس سے کسی طرح کی بات چیت نہیں کرتے، نہ اُسے کہیں نوکری ملتی ہے، نہ بازار میں اُسے کوئی چیز مل سکتی ہے، نہ گھر پر۔ اُس کے چاروں طرف ایک خلاسی قائم کر دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی دنوں میں یا تو اُس کا مزاج درست ہو جاتی ہے۔ اور یا وہ شخص بھوکا پیاسا مر جاتا ہے۔ اسی عدم تعاون کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں اشتراکی مر گئے۔ اور آج کہیں ڈھونڈنے سے بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔

لیکن یہ تو تشدّد ہے! میں نے بلند آواز میں کہا۔ صاف تشدد ہے اور کیا۔

اُس بزرگ نے اِدھر اُدھر دیکھا کر کہا۔ آہستہ سے بات کرو۔ اگر کسی راہ چلتے نے سن لیا۔ تو ہماری زندگی سے بھی عدم تعاون کر دیا جائیگا۔ پھر وہ بلند آواز میں کہنے لگے۔ کیوں صاحب اس میں تشدد کیا ہے؟ ہم نے انہیں قید نہیں کیا۔ پھانسی نہیں دی۔ اُن کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی۔ ہم پر تشدد کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے فوج اور پولیس کو رکھنا ضروری نہیں خیال۔ اور دراصل اس ملک کی فضا میں یہ دونوں محکمے غیر ضروری سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے کسی کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ منصف اور وکیل سارا دن بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ اور تکلی پھیرتے رہتے ہیں۔

کبھی کوئی دنگا فساد نہیں ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے وقت دونوں ہاتھ جوڑ لیتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ اگر کسی سے کسی بات پر ناراضگی پیدا ہو جائے تو اُسے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ اپنی جان پر فاقہ کر کے اُس کا پرائشچت (کفارہ) ادا کرتے ہیں۔ ملک میں کپڑے کے کارخانے مدت سے بند ہو چکے ہیں۔ اور ہاتھ کا بنا ہُوا کپڑا ساری آبادی کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے کروڑوں آدمی نیم برہنہ رہتے ہیں۔ لوگ عیش و آرام کو مطلق پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے گھروں سے کرسیاں، صوفے، اگلدان، غالیچے، سب نکلوا کر جلا دیئے ہیں۔ یہ لوگ زمین پر سوتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور دن رات پرماتما کے دھیان میں لگن رہتے ہیں۔ بازاروں میں بکریاں ئیں ئیں کرتی پھرتی ہیں۔ اور اپنے مالکوں کے لئے سودا سلف خرید کرے جاتی ہیں۔

عورتوں کی عزت و توقیر کے معاملے میں ہندوستانی سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہاں ہر عورت کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ گو رسمی طور پر شادیاں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا عورت کیا مرد ہر ہندوستانی فرد "برہمچریہ" کے اصول کا شیدائی نظر آتا ہے۔ محکمہ اعداد و شمار سے دریافت کرتے پر مجھے پتہ چلا۔ کہ پچھلے بیس سالوں میں سارے ہندوستان میں صرف چھ بچے پیدا ہوئے یہ چھ بچے برہمچریہ کے اصول کی شاندار کامیابی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر ہندوستان کے کل باشندے برہمچریہ کے اصول پر اسی سختی سے کاربند رہے۔ تو وہ دن دور نہیں۔ کہ جب سارے ہندوستان میں کوئی بچہ نہ پیدا ہو سکے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پچھلے تیس سالوں میں ہندوستان کی آبادی ایک

تہائی کم ہو گئی ہے۔ اور اگر یہی حال رہا تو عین ممکن ہے۔ کہ اگلی نصف صدی تک سارا ہندوستان نروان حاصل کر لیگا۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ راس راجندر سے لے کر کوہ کر یلاتی تک آپ کو کہیں بھی ایک بھی بشر نظر نہ آئے گا۔ سروچولھے سنسان بازار، اور رمبھاتی ہوئی یکہ یاں۔ . . . کتنا دلکش اور روح پرور نظارہ ہے . . . ہندوستان کے باسی مکتی حاصل کر کے، بیکنٹھ سدھار گئے ہیں۔ دیوتا آسمان سے پھول برسا رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے روحانی مہاتماؤں کی جے کے نعرے لگا رہے ہیں! . . . .

حیرت تو یہ ہے کہ ان نرالے، انوکھے اور پر امن لوگوں کے ملک پر دوسرے ملک کیوں حملہ نہیں کرتے؟ درحالیکہ ہندوستانیوں کے پاس نہ فوج ہے نہ اسلحہ نہ ہوائی جہاز، شاید اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ غیر ممالک کی جنگجو اور غیر مذہب قومیں اس انتظار میں ہیں۔ کہ کب یہ ہندوستانی اپنے دوامی برہمچریہ فلسفے کے طفیل اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔ اور پھر وہ یہاں آ کر اس خالی اور سونے ملک کو آباد کریں۔ جو چیز تھوڑے سے انتظار سے اور بغیر لڑائی جھگڑے کے حاصل ہو سکتی ہو۔ اُسے کشت و خون سے کیوں حاصل کیا جائے!

دو سال کی سیاحت کے بعد میں برازیل واپس چلا آیا۔ میرا جی اپنے ملک سے بہت جلد اُکتا گیا۔ وہ ملک جہاں کوئی کسی سے عشق نہیں کر سکتا، جہاں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔ جہاں سب لوگ سچ بولتے ہیں۔ بکری کا دودھ پیتے ہیں۔ اور لنگوٹ باندھ کر خدا کو یاد کرتے ہیں:

مانگے کی کتابیں

کل اردو کے ایک مؤقر جریدے کے مدیر نے جن کے لئے میرے دل میں بہت عزت ہے۔ باتوں باتوں میں مجھ سے کہا۔ ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں مانگے کی کتابیں پڑھنے کی بیماری ہے۔ اسے جس طرح ہو سکے دُور کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ عادت دُور نہیں ہوتی۔ کتابوں اور رسائل کی اشاعت نہیں بڑھ سکتی اور مصنف کو اُس کی محنت کا معاوضہ نہیں مل سکتا۔ نریندر، جو قریب ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ تو ایسی کیا تدبیر ہو سکتی ہے جس سے یہ لعنت پڑھے لکھے طبقے سے دُور ہو جائے۔ اور لوگ کتابیں مانگ کر پڑھنا چھوڑ دیں۔ بلکہ خریدنا شروع کر دیں۔ مؤقر جریدے کے مدیر نے کہا ہے تو یہ ایک ٹیڑھی سی کھیر لیکن —— اور یہ کہتے ہی اُن کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں۔ اور اُنہوں نے میز پر مکا مار کر ایک جوان آدمی کی سی

آواز میں کہا۔ بھئی میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ نریندر تن کر بیٹھ گیا اُس کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے اور وہ سرگوشیانہ انداز میں اک دم بول اُٹھا۔ کیا تدبیر ہے وہ۔ بتایئے نا۔

میرے خیال میں ایک لیگ بنائی جائے۔ مؤقر جریدے کے مدیر نے کہا۔ جس کی شاخیں تمام ہندوستان میں ہوں۔ اِس لیگ کے کم از کم ایک لاکھ ممبر ہوں۔ ہر ایک ممبر سے ایک عہدنامے پر دستخط کرائیں کہ وہ ہر مہینے کم از کم ایک روپیہ کی کتابیں ضرور خریدیگا۔ اس طرح سے کتابوں کے نکاس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اور اب مصنفوں کو روٹی مہیا کر سکتا ہے۔

نریندر نے خوش ہو کر کہا۔ واہ۔ کیا اچھی تدبیر ہے۔ نہ جانے پہلے کسی کو کیوں نہیں سوجھی۔ اچھا مگر اس کو شروع کس طرح کیا جائے؟

میں نے کہا۔ ہاں۔ یہ شروع کرنے کی بات ذرا مشکل ہے۔ اِس لیگ کا صدر کون ہو۔ قواعد و ضوابط کیا ہونگے۔ کاروائی کس زبان میں ہو گی۔ چندہ، اور چندے کا حساب رکھنے کے لئے اس دنیا میں ایک ایماندار آدمی بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ اِن تمام باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مولینا یہ کیا قصہ چھیڑ دیا آپ نے؟

مولینا نے مجھے چپ کرانے کے لئے کہا۔ عزیزِ من۔ تم تو ہر چیز کو ساون کے اندھے کی طرح دیکھنے کی عادی ہو۔ یہ سب باتیں تو دوستوں کی ہمدردی اور تعاون سے حل کی جاسکتی ہیں۔ پراپیگنڈے کے لئے پمفلٹ چھپانے چاہئیں جس میں اس بات کی وضاحت کی جائے۔ کہ مانگے کی کتابیں پڑھنے کے کیا کیا نقصانات ہیں۔

دراصل میں تو اس بات کو بہت بُری طرح محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ کیوں اپنے ادب کی عملی سرپرستی قبول نہیں کرتا۔ اگر ہم لوگ ہمت کرکے اس کام کو ہاتھ میں لے لیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ان ایک لاکھ ممبروں کی مدد سے ہمارے ادب کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

"کایا کلپ کہئے۔ یہ آجکل کا فیشن ہے جو زورناف کے بندروں سے شروع ہُوا۔ اور مالویہ جی تک جا پہنچا۔ اور اب آپ اسے ادب پر آزمانا چاہتے ہیں"!

میں نے ذرا تیز ہو کر کہا "بھلا کہیں اس پمفلٹ بازی سے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی عادات کو بدلا جا سکتا ہے۔ یہ آپ کی لیگ ایک قسم کی کاغذی جماعت بنکر رہ جائیگی۔ آپ کسی کو عہد نامے پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ مولینا آپ بھی کیسی روحانی باتیں کرتے ہیں"!

نریندر ایک لمبی سانس لیکر بولا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ آپ کسی کو کتابیں خریدنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ محض ایک خیالی اور رومانوی سی تجویز ہے۔ مولینا نے مسکراتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تمہاری تو ضدی بچوں کی طرح باتیں کرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔

اب میں جوں جوں اس لیگ کے قیام کے متعلق غور کرتا ہوں مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں مولینا کی مخالفت کی۔ یہ لیگ اگر خارجی حالات کی وجہ سے ایک اجتہادی جماعت نہ بن سکے تو کم از کم ایک اصلاحی جماعت ضرور بن سکتی ہے ٹمپرنیس لیگ کی طرح۔ انسدادِ شراب خوری کی طرح، ملنگے کی کتابیں پڑھنے والوں کا بھی انسداد کیا جا سکتا ہے۔ یا کم از کم اُن کے بہتر جذبات کو اس بُری عادت کے خلاف ابھارا جا سکتا

ہے۔ پمفلٹ نکالے جائیں۔ جلسے کئے جائیں۔ جلوس نکالے جائیں۔ ذرا خیال کیجئے۔ کہ شہر کے سب ادیب مل کر بازار میں سے ایک جلوس کی شکل میں گزر رہے ہیں۔ ہم سب نے کاغذ کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ گتوں پر موٹے موٹے حروف میں خوبصورت اور اصلاحی مقولے درج ہیں۔

"مانگے کی کتابیں پڑھنا حرام ہے!"

ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے گزارا جا سکتا ہے۔ لیکن مانگے کی کتابیں پڑھنے والے کو جنت کے دروازے سے نہیں گزارا جا سکتا!"

"جو مانگے کی کتابیں پڑھتا ہے، وہ ملک سے غداری کرتا ہے"

اور مولینا اپنی پھندنے والی لمبی کاغذی ٹوپی کو آگے بڑھا کر کہتے ہیں "اللہ تو شوق دے ——— !"

ہم سب مل کر کہتے ہیں "تو کتابیں پڑھا کرو!"

مولینا پھر کہتے ہیں "ہم کیا چاہتے ہیں؟"

میں جواب دیتا ہوں "مانگے کی کتاب"۔۔۔ غلطی ہوئی۔ کہنا چاہیئے تھا۔ "کتابوں کی فروخت" خیر۔ اس عظیم الشان جلوس میں طوطی کی آواز کو سنتا ہے۔ نہ بندر چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔

"مانگے کی کتاب پڑھنے والا؟"

"مردہ باد!" ہم سب مل کر چلاتے ہیں۔ اور اس طرح سے شور و غوغا کرتا ہوا یہ جلوس بازار میں سے گزر جاتا ہے

اقتصادی لحاظ سے قطع نظر ایک نفسیاتی نکتہ یہ ہے۔ کہ جو لطف مانگے کی

کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ انہیں خرید کر پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا خرید کر آدمی ہر وقت یہی سوچنے لگ جاتا ہے کہ خدا جانے میں نے جو تین روپے خرچ کرکے یہ کتاب حاصل کی ہے، اچھی بھی ہے یا نہیں۔ پڑھتے وقت بھی یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ تین روپے ضائع گئے۔ کتاب کے محاسن پر نگاہ کم جاتی ہے۔ لیکن اگر کہیں ایک فقرہ بھی کھٹک گیا تو بس جی جل ہی جاتا ہے "حرامزادہ ادیب بنا پھرتا ہے ... لکھنے کی تمیز نہیں .. کیا واہیات کتاب ہے ... اس پبلشر کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر یونہی تین روپے لٹا دیئے ... بس ایک تاجرانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بخلاف اس کے اگر مانگے کی کتاب ہو تو جی سدا خوش رہتا ہے۔ دل میں ٹھنڈک اور آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔ آدمی کتاب کے محاسن و معائب صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے اس کے نقائص کو ادیب کی "بشری اور ذہنی کمزوری" یا "خارجی حالات کی مجبوری" کہہ کر اُسے دل ہی دل میں معاف کر دیتا ہے۔ اس کی خوبیوں کو سراہتا ہے۔ اُسے بار بار پڑھتا ہے اور اُسے لوٹا دینے سے ہچکچاتا ہے۔ ہائے کتنی اچھی کتاب ہے۔ اور پھر اسی لالچ میں اکثر اُسے گم کر دیتا ہے۔ اور پھر اس کا دوست تنگ آکر ایک اور نئی جلد خرید لیتا ہے۔ کیونکہ اُسے کتاب کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو خریدتا کیوں۔ غرضیکہ مانگے کی کتاب پڑھنے سے ایک خریدار اور بڑھ گیا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں ہر شخص مانگے کی کتاب پڑھے تو ہر ایک کتاب کی اشاعت کروڑوں تک جا پہنچے بجائے اس کے کہ لوگ مانگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کریں۔ یہ بہتر ہوگا کہ ایک ایسی لیگ بنائی جائے۔ جو ہر

ہندوستانی کے ہاتھ میں ایک مانگے کی کتاب پہنچانے کا انتظام کرے۔ دیکھئے پھر ادب ترقی کرتا ہے کہ نہیں اور لوگوں میں صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ میں خود ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے دنیا کے بہترین ادیبوں کی کتابیں مانگ تانگ کر پڑھی ہیں۔ اور جب بھی میں خود کوئی کتاب خریدتا ہوں تو مجھ سے مانگ کر پڑھنے والے دوست اُسے مجھ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لطف کتاب میں نہیں بلکہ اُسے مانگنے میں ہے۔ محبوب میں نہیں بلکہ تمنائے محبوب میں۔

ہاں! اقتصادی حالات کے پیشِ نظر مولینا کا شکوہ صحیح ہے اور ہندوستان کے ادیبوں کی غریبی اور مظلومی بھی ایک امر مسلم ہے۔ لیکن اس کا علاج یہ ایک لاکھ ممبروں والی لیگ نہیں کر سکتی۔ خارجی حالات یہ ہیں۔ کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بلحاظ آبادی ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ اور ان میں سے بہت سے لوگ برائے نام پڑھے لکھے ہیں۔ جو نہ ہماری کوثر میں دھلی ہوئی زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور نہ مہاشیہ پرشد کی ادبی موشگافیوں کو، جو لوگ باقی رہ گئے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں۔ جو محض اوکاڑہ منڈی اور بمبئی بھٹنڈہ تج کی ا۔ئی کا بھاؤ معلوم کرنے کے لئے اخبار خریدتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ہاتھ لگ جائے تو پہلے اُس میں شری کرشن مہاراج کی صورت تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر نہ ملے تو رسالہ پھیر دیتے ہیں۔ پھر چنو منو حلوائی ہیں جو اپنے گاہکوں کیلئے روز ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے ہیں۔ پھر اس اخبار کی جو حالت ہوتی ہے۔ خدا کی پناہ ایک ورق الگ کیا جاتا ہے۔ کالم در کالم الگ الگ پھاڑ لئے جاتے ہیں۔ ایک گاہک ہے کہ تین ٹانگوں والی کرسی پہ بیٹھا غٹا غٹ لسی پی رہا ہے۔ اور جناب شاور ہنکوی کا سنسنی خیز افسانہ پڑھ رہا ہے۔ دوسرا گاہک سڑک کے کنارے چارپائی پہ آسن

جمائے گلگلے کھا رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ شہزادہ صاحب کے لکھے ہوئے سیاسی چٹکلے پڑھتا جاتا ہے۔ اتنے میں تیسرا گاہک آ کر اخبار پر جھپٹا مار کر کہتا ہے "ہائیں۔ فن لینڈ کا کیا ہوا"؟ غرضیکہ شام ہونے تک اخبار سینکڑوں ہاتھوں میں سے گزر جاتا ہے۔ اور پھر دکان بند کرتے وقت حلوائی اُسی اخبار میں باسی پکوڑیاں لپیٹ کر کسی مجھ ایسے غریب ادیب کو دے دیتا ہے

سپردم بتو مایۂ خویش را

پھر وہ لوگ ہیں۔ جنھوں نے پنشن حاصل کر لی ہے یا ٹھیکیداری سے فراغت پالی ہے اور جمع پونجی سے ایک مکان یا کوٹھی بنالی ہے۔ اور اب عاقبت کو سدھارنے کی فکر میں ہیں۔ ان میں سے کوئی انجنیئر تھا۔ کوئی پولیس افسر کوئی کسی فرم کا منیجر۔ یا بنک کا ڈائرکیٹر۔ یا ریٹائرڈ جج۔ اب یہ لوگ دن رات مالا جپتے ہیں۔ اور اپنے گناہ بخشواتے کی تاک میں ہیں۔ انہیں مولانا کے ادب سے کیا سروکار۔ یہ لوگ خریدتے ہیں۔ رسالہ "دھرم پرکاش"، یا "نورِ ایمان"، چنانچہ ہندوستان میں سب سے کثیر الاشاعت رسالے یہی مذہبی رسالے اور اخبار ہیں۔ اب جو باقی رہ گئے۔ ان میں ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو ہمیشہ انگریزی کتابیں خریدتے ہیں۔ وہ ایک پست درجے کے انگریزی ادیب کی کتاب لیں گے۔ لیکن "ورنیکلر لٹریچر"، کبھی نہیں خریدینگے۔ اس سے اُن کے حسِ ادب کی تسکین ہوتی ہے۔ اور اب جو بچے۔ انہیں ادب سے مس تو ضرور ہوتا ہے لیکن ایک مہینہ کی مشقت کے بعد اُن کی جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں ہوتا

اور اگر بچ جائے تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی کتاب یا خرید لیتے ہیں یا کسی سے مانگ کر پڑھ لیتے ہیں۔ میرے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ جن کا موٹروں کا کاروبار ہے۔ ایک اور صاحب ہیں جو کسی بنک میں ملازم ہیں۔ میں جو اخبار منگاتا ہوں اور ابھی پوری طرح نہیں پڑھ چکتا۔ کہ موٹروں والے صاحب اخبار منگوا بھیجتے ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح پڑھنے نہیں پاتے کہ بنک کے بابو استدعا کرتے ہیں۔ کہ انہیں دفتر جانا ہے اس لئے اخبار انہیں جلد بھیجدیا جائے۔ کبھی تو وہ اخبار پڑھ کر واپس بھیج دیتے ہیں۔ اور کبھی اُن کے ننھے کی اماں اُسے چولھے میں جھونک دیتی ہیں۔ دراصل اخبار کا اس سے بہتر مصرف اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

دراصل مانگے کی کتابیں پڑھنا اور مانگے کی چیزیں حاصل کرنا ہندوستانیوں کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ یہاں صرف کتابیں ہی ادھار نہیں دی جاتیں۔ مجھے اپنے اس بھولے دوست کی یاد ستاتی ہے۔ جو ایک دن میرا نیا گرم سوٹ مانگ کر لے گیا تھا اور ابھی تک تنازع للبقا کے صدقے میں اُسے واپس نہیں کر سکا۔ وہ نئی کرسی جو ہمسائے نے اپنے گھر میں بہت سے مہمان آجانے کی وجہ سے منگوالی تھی اور جو اب مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد بھی، اُسی ہمسائے کے دیوان خانے کی زینت بن گئی ہے۔ ہندوستان میں زندگی اُدھار کے سہارے چلتی ہے۔ ساہوکار کسان کو زمین کاشت کرنے کے لئے اُدھار دیتا ہے اور جمال بک ڈپو کا مالک غریب کلرکوں کو ناول کرایہ پر دیتا ہے۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ آبادی چالیس کروڑ ہے اور رقبہ بہت کم اس زمین پر کالے جسموں والے انسان حشرات الارض کی طرح چلتے ہیں۔

جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ آمد فی کس چھ پیسہ سے زیادہ نہیں۔ یہاں ہر چیز مانگے کی ہے۔ لوگ کتابیں مانگ کر پڑھتے ہیں۔ کسان ساہوکاروں سے کاشت کے لئے بیج مانگتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ناول کرایہ پر دیئے جاتے ہیں بلکہ بیویاں بھی۔ یہاں زندگیاں گروی رکھی جاتی ہیں۔ اور چاندی کی چند ٹکیوں کے عوض روحیں مستعار لی جاتی ہیں۔ ان رگوں میں یاسیت اور غدّاری اور ذلّت رچی ہوئی ہے۔ مانگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کرتے ہو۔ لیکن کون ہے جو ان مانگے کی روحوں کے خلاف جہاد کریگا! جو خود بک چکا ہو وہ کیا خریدے گا۔

مستعار چیزوں کے سلسلہ میں مجھے ایک بات یاد آگئی ہے۔ ایک دفعہ مجھے ضلع کے نواحی دیہات میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ ایک جاٹ دوست تھا۔ اُس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ لیکن اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ جب میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں عورتوں کی تعداد بہت کم کیونکہ کچھ عرصہ پہلے خاص کر سکھوں کے زمانہ میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اس لئے عورتوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اور اس لئے وہ ابھی تک نہیں بیاہا تھا۔ لیکن اُس کے بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ اکثر اس سے اسکی بیوی مانگ لیا کرتا تھا۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ عدالتوں میں ایسے مقدمے بارہا آتے ہیں۔ جن میں ایک بدصورت ادھیڑ عمر کی عورت کو حاصل کرنے کے لئے چار پانچ قتل ہو گئے ہوں۔ اور ایسے بھی بہت سے مقدمات ہوتے ہیں۔ جن سے پتہ چلا ہے۔ کہ جب کوئی غریب کسان جاگیردار یا ساہوکار کا سود در سود

نہ ادا کر سکا ۔ تو اس نے تنگ آکر اپنی بیوی گرو رکھ دی ۔ ہندوستان ہر لحاظ سے ایک غریب ملک ہے ۔ اس لئے یہاں مانگے تانگے بغیر جینا دوبھر ہو جاتا ہے ۔ اب جب میں ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں ۔ تو مجھے حیرت ہوتی ہوتی ہے ۔ کہ میں کیسا فرشتہ ہوں ۔ کہ اس ہندوستان جنت نشان میں جہاں مانگے کی بیویاں بھی ہوتی ہیں ۔ محض مانگے کی کتابیں پڑھنے پر اکتفا کرتا ہوں ؞

پانی کا گلاس

(ایک پیروڈی)

(ترنجن گھوسی کی مشہور فلم ٹریجیڈی کے آخری چند منظر)

سین اٹھارہواں:-

موٹی موٹی آنکھوں والی چھوٹے قد والی ہیروئن جو پردۂ سیمیں سے باہر بھی دھوئیں سی نظر آتی ہے۔ باغ میں چہل قدمی کر رہی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ پھول مسکرا رہے ہیں۔ طوطے بول رہے ہیں۔ ہیروئن خوشی سے گنگناتی ہے "ایک تھا طوطا ایک تھی راتی"۔ ایک تھا دھوبی۔ جس کی آواز بلند کرتے ہوئے چہرے کو جذبات کا حامل بناتے ہوئے، جس کی. . . جس کی (آواز دھیمی ہو رہی ہے۔ آواز میں لرزشیں۔ ہچکولے اور سسکیاں) جس کی. . . آنکھ تھی کانی. . . آواز بلند کرتی ہے۔ اور پھر یک لخت چپ ہو جاتی ہے۔ پیچھے سے درختوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزرتا ہیرو ہیروئن کی طرف کھنچا ہوا آ رہا ہے۔ ہیروئن جتنی موٹی ہے ہیرو

اتنا پتلا اور لمبے قد کا جوان ہے۔ کنپٹیوں اور بالوں کے لمبے لمبے خطوط اپنی شکل و صورت چال ڈھال سے بالکل چور معلوم ہوتا ہے۔ آہٹ پاکر ہیروئن مڑتی ہے۔

ہیروئن۔ ہائیں تم نے تو مجھے بالکل ہی ڈرا دیا تھا۔ دکھ بھنجن۔

دکھ بھنجن: (معلوم ہوا کہ یہ ہیرو کا نام ہے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر) کس نے ڈرا دیا تھا؟

۔۔۔ میں نے؟ ۔۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے گلگلی؟

گل گلی۔ (ثابت ہوا کہ گلگلی ہیروئن کا نام ہے کسی مٹھائی کا نہیں) میں گا رہی تھی کہ تم آ گئے

ہیرو: کیا گا رہی ہو۔ میں نے دور سے سنا۔ جیسے آسمان میں اپسرائیں گا رہی تھیں میں بھاگا بھاگا تمہاری طرف چلا آیا (ہیروئن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور موٹی بے سری آواز میں گانا شروع کر دیتا ہے) "ایک تھی دیوی ایک تھا دیوتا"، پھر دفعتاً ہنسنے لگتا ہے۔

کیوں ہنس رہے ہو؟

ہیرو:۔ میں سوچتا ہوں گلگلی۔ کہ۔ کہ۔

ہیروئن:۔ ہاں۔ ہاں کہو۔

ہیرو۔ کہ آج میرا گلا کام نہیں کرتا۔ اگر میں ایک پانی کا گلاس۔

ہیروئن: شش۔ شش۔ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے۔

(دکھ بھنجن یہ تم کیا کہہ رہے ہو) اگر پتا جی سن پائیں تو وہ سسکیاں لینے لگتی ہے)

دکھ بھنجن:۔ غمگین آواز میں) مجھے کھشما کرو گلگلی۔ مجھ سے بھول ہوئی (ہیرو کا گلا

بھر آتا ہے۔ لیکن پانی سے نہیں ۔ فرطِ غم سے ، بس —— بس ——
اب کبھی تم سے پانی —— کا گلاس نہیں مانگوں گا دگاتا ہے ،

ایک ننھی نانی ایک ننھا نانا

گلاس میں پانی تھالی میں روٹی

دنیا ہے آنی جانی

داکوارتہ میں لوچ ہے ۔ اور دُور تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں)

گلگلی ۔ دساڑھی کے پلّو سے اپنے اور دکھ بھنجن کے آنسو پونچھتے ہوئے) مت رو
دکھ بھنجن ۔ مت رو ۔ اس سنسار میں ایسا ہی ہوتا ہے ۔ کسی کو روٹی نہیں
ملتی کسی کو پانی کا گلاس ۔ لیکن محبت کی جیت بھی ہار ہے اور ہار بھی جیت ۔
یہاں محبت ہے وہاں پانی کے گلاس کی کیا پروا ہو سکتی ہے ۔ دکھ بھنجن ۔
دکھ بھنجن ۔

ہیرو ۔ (اپنی لمبی تھوتھنی کو فرطِ غم سے اور بھی لمبا کرتے ہوئے) گلگلی ۔

ہیروئن ۔ کیا کہا ۔

ہیرو ۔ گلگلی ۔

ہیروئن آنکھیں بند کر لیتی ہے اور ہیرو کی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیتی ہے ۔

" ایک بار پھر کہنا "

ہیرو ۔ گلگلی

ہیروئن ۔ پھر کہو

ہیرو ۔ گلگلی ۔ گلگلی ۔ میری جان ۔

ہیروئن ۔ پھر کہو ۔ ہائے پھر کہو ۔

ہیرو ۔ دننگ آکس گلگلی ۔ گلگلی ۔ گلگلی ۔

(تعنۃ) ۔ پھر باغ کے باہر گدھوں کی ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز آتی ہے ۔ ہیرو اور
ہیروئن دونوں کانپ جاتے ہیں ۔

ہیروئن ۔ پتا جی آ رہے ہیں شاید ۔

ہیرو ۔ (ڈھارس دیتے ہوئے) گھبراؤ مت ۔ جہاں پریم ہے ۔ وہاں ڈر کیسا ۔ پریم
کے سائے تلے اور پریمی دل ۔ ہاں پریمی پاگل دل ۔

(گدھوں کے بولنے کی زور زور سے آوازیں ۔ ہیرو اور ہیروئن کانپ جاتے
ہیں ۔)

ہیرو ۔ (ڈر کر) چلو گلگلی کلکتے چلیں ۔

ہیروئن ۔ چلو کلکتے چلیں ۔

(دونوں کلکتے جاتے ہیں ۔ دو تین منٹ فلم پر گاڑی کے سین ۔ ریل کی لائن الہ آباد ۔
شاہدرہ ۔ بٹھنڈہ ۔ مدد کے ۔ چلو کے رکھو گے ۔ اور پھر یکایک کلکتہ ۔)

(سین بدلتا ہے)

ایک بیحد جاذبِ نظر ڈرائنگ روم ایک صوفے پر گلگلی خوبصورت ساڑھی پہنے
رو رہی ہے ۔ اور ایک خوبصورت رومال سے اپنی خوبصورت آنکھوں کے خوبصورت آنسو
پونچھتی جاتی ہے ۔ بیچ بیچ میں خوبصورت سسکیاں بھی لیتی ہے ۔ بائیں طرف ایک
کرسی پر گلگلی کا باپ سیٹھ کامتا پرشاد سامنے ایک تپائی پر جھکا ہوا اداس سا بیٹھا ہے
سارے کمرے پر رقت کا عالم طاری ہے ۔ اس سین کو دیکھ کر بہت سے تماشائی خاص کر

بوڑھے اور عورتیں اپنے اپنے رومال جیبوں سے نکال کر ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔

گلگلی ۔ (صوفے سے اچھل کر یکایک چیختی ہوئی، ہائے میں نے اسے پانی کا گلاس کیوں نہ دیا!)

سیٹھ کامتا پرشاد ۔ (کرسی سے اچھل کر) ایسا کبھی نہ ہوگا۔ یہ ہمارے خاندان کی رسم کے خلاف ہے (آہستہ سے گلگلی کی طرف جاتا ہے) نرم آواز میں۔ صبر کرو۔ بیٹی! . . . .

گلگلی ۔ (پرے ہٹ جاتی ہے) مجھے مت چھوؤ۔ (روئی وشٹ) ۔

کامتا پرشاد ۔ (گلوگیر لہجہ میں) آہ! میں تمہارا باپ ہوں (صوفے پر گر پڑتا ہے ڈاکٹر دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر ۔ سیٹھ صاحب بہت افسوس ہے۔ لیکن میں پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکونگا۔ کہ دکھ بھنجن پاگل ہوگیا ہے اسے مالیخولیا ہوگیا۔

سیٹھ کامتا پرشاد ۔ کیا کہا مالیخولیا؟ (صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوجاتا ہے)

گلگلی ۔ (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے خوف لہجہ میں) اسے مالیخولیا ہوگیا ہے۔ وہ پاگل ہوگیا ہے۔ میرا دکھ بھنجن آہ۔

ڈاکٹر (افسردہ لہجہ میں) ہاں اسے مالیخولیا ہوگیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی اُسے پانی کا گلاس پینے کو نہیں دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا گلا خشک ہو رہا ہے۔ دم گھٹ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر کہتا ہے۔ پانی کا گلاس۔ گلگلی پانی کا گلاس۔

گلگلی ۔ (فیصلہ کن لہجہ میں) میں اسے پانی کا گلاس لا کر دوں گی۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤنگی۔ لیکن اپنے پیتم کیلئے سب کچھ کرونگی۔ گانا شروع ہوتا ہے۔

کوئی . . . . ای . . . . ای

. . . . ای لائے کہاں سے پانی کا

گلاس ۔ کوئی . . . . . . ای . . . . ای

. . . . ای

کامتا پرشاد ۔ (گلگلی کا بازو جھنجھوڑ کر) نادان لڑکی! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔

(دکھ بھنجن کمرے کے اندر داخل ہوتا ہے ۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ہے) ۔

دکھ بھنجن ۔ کل میں نے ایک سپنا دیکھا ۔ سنتی ہو گلگلی! میں نے کیا دیکھا کہ میرے دل کی ملکہ گلگلی ایک چاندی کے گلاس میں پانی بھر کر لا رہی ہے ۔ میرے لئے ۔ میرے لئے صرف میرے لئے ۔

(گاتا ہے)

میں نے دیکھا اک سپنا نیارا

ہلکا ہلکا بھارا بھارا

(جھومتے ہوئے تیز سُروں میں)

پانی کی مچھلی پانی کا کچھوا

پانی کی مچھلی پانی کا کچھوا

پانی ہی پانی سارا

جی میں نے اک دیکھا سپنا نیارا

گانا ختم کرتے کرتے دکھ بھنجن ہنسنے لگتا ہے ۔ بہت سے تماشائی نزار

قطار رو رہے ہیں۔ گلگلی اسی اثنا میں ایک چاندی کے گلاس میں پانی لے آئی ہے۔

گلگلی۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میری طرف دیکھو دکھ بھنجن تمہاری گلگلی سماج کے سب بندھن توڑ کر اپنے ماں باپ سے منہ موڑ کر دکامتا پر شادا آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اُسے وہیں روک دیتا ہے) تمہارے لئے پانی کا ایک گلاس لائی ہے۔

ہیرو۔ کیا تم گلگلی ہو! ہنستا ہے ہا ہا ہا) میری گلگلی۔ آخر تم آگئیں گلگلی۔

ہیروئن۔ ہاں میں آگئی۔

ہیرو۔ تم آگئیں۔ لیکن پانی نہ آیا۔ اسی جھنجھٹ میں گئی عمر یا بیت دگنا چاہتا ہے۔ لیکن گلگلی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

گلگلی۔ دکھ بھنجن۔ دکھ بھنجن۔

(ہیرو ہنستا ہے اور ہنستے ہنستے یک لخت پیٹ میں چھری پھونک لیتا ہے اور وہیں فرش پہ گر پڑتا ہے) (چیخ مار کر اور گلاس میز پر رکھ کر) میرے دکھ بھنجن ... (پس منظر میں موسیقی۔ دلدوز اور درد میں ڈوبے ہوئے نغمے سنائی دے رہے ہیں۔ سینما ہال میں سسکیوں کی آوازیں۔)

گلگلی۔ ہاں آج میرے پریم کی شام ہو گئی۔ میرے پریم کا سورج ڈوب گیا۔ میری الفت کی نیا بادِ مخالف کے جھونکوں اور سمندر کے تھپیڑوں سے الٹ گئی۔ دکھ بھنجن، میرے یتیم۔ تیری موت میں میری زندگی ہے۔ اور میری زندگی میں تیری موت، میں ہمیشہ تیری یاد میں جیوں گی۔ آج میرے جیون کی انوکھی ناریکی میں تیری

موت کا سنگیت ایک کنول کے پھول کی طرح مسکرا رہا ہے۔ گلاس کو میز پر سے اٹھا لیتی ہے۔ میں اس خونی گلاس کا ایک ایک قطرہ پی جاؤنگی اور پی کر ہمیشہ کے لئے سکھ کی نیند سو جاؤں گی (گلاس کو منہ کی طرف لے جاتی ہے)

کامتا پرشاد۔ (گھبرا کر) گلگلی، گلگلی، میری بیٹی یہ تو کیا کر رہی ہے تو مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہے۔

گلگلی۔ (پانی پی کر گلاس خالی کر دیتی ہے) "پتا جی میں چلی (فرش پر گر جاتی ہے)

پس منظر میں موسیقی کے بلند نغمے اچھل رہے ہیں۔ ڈاکٹر اور کامتا پرشاد حیرانی سے دیکھتے ہیں۔

(سین بدلتا ہے)

ڈاکٹر کا اپریشن روم۔ دو لمبی میزوں پر گلگلی اور دکھ بھنجن کے جسم رکھے ہیں کمپونڈر، نرس، دو تین ڈاکٹر، تین چار صوفے، ایک الماری میں کتابیں، غرضیکہ ایک اپ ٹو ڈیٹ اپریشن روم نظر آ رہا ہے۔

کامتا پرشاد۔ (ایک ڈاکٹر سے دھیمے لہجہ میں) ڈاکٹر صاحب! کیا۔ ۔ ۔ ؟

ڈاکٹر۔ شش ش۔ چپ رہو۔

کامتا پرشاد۔ (دوسرے ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب میں۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر۔ ہش بات مت کرو۔ گلگلی کی نبض واپس آ رہی ہے۔

کامتا پرشاد۔ (آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر) "اے پرماتما۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک نرس۔ (لب پر انگلی رکھ کر) شش ش۔ ۔ ۔ شور نہ کرو۔ سیٹھ صاحب"

تیسرا ڈاکٹر۔ (نرس سے) شش ش۔ ۔ ۔ اونچی آواز میں مت بولو" نرس سیٹھ صاحب

کو کمرے سے باہر لے جاؤ۔

ڈسپنسر کامتا پرشاد نرس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ اسے ہاتھ سے تھام کر کمرے سے باہر لے جاتی ہے۔ اور پھر فلم کے اختتام تک دونوں واپس نہیں آتے۔ شاید اگلے ریسٹورانٹ میں چائے پینے چلے گئے ہیں)۔

پہلا ڈاکٹر۔ ہیلو ہریسن۔

دوسرا ڈاکٹر۔ ہیلو جونز۔

تیسرا ڈاکٹر۔ ہیلو مینتھوز، لڑکا تو بچ جائے گا۔ امید ہے اور اب اس کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائیگا۔ دیکھو ہوش میں آ رہا ہے۔

(تینوں ڈاکٹر اس کے جسم پر جھک جاتے ہیں)

دکھ بھنجن۔ (کمزور آواز میں) میں کہاں ہوں.... پانی.... پانی۔

ڈاکٹر پانی کی دو چار بوندیں ٹپکاتا ہے، دکھ بھنجن اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔

لاؤ.... لاؤ.... لاؤ.... یہ میرا پیٹ کیوں باندھ رکھا ہے؟

تیسرا ڈاکٹر۔ کچھ نہیں معمولی سی خراش آ گئی تھی۔

ہیرو۔ وہ کیسے؟

دوسرا ڈاکٹر۔ ہشش.... گلگلی ہوش میں آ رہی ہے!!

دکھ بھنجن۔ (میز سے اچھل کر اور چلا کر) گلگلی

گلگلی۔ (آواز سنتے ہی میز سے اچھل پڑتی ہے) میرے بیتم!

(دکھ بھنجن کے گلے سے لگ جاتی ہے)

تیسرا ڈاکٹر۔ ہیلو بیتھوزہ۔

دوسرا ڈاکٹر۔ ہیلو جوتز

پہلا ڈاکٹر۔ ہیلو ہریسن

(تینوں ڈاکٹر ٹوپیاں اٹھا کر آہستہ سے باہر چلے جاتے ہیں غالباً وہ بھی نکڑ والے ریسٹوران میں چلے گئے ہیں۔)

ہیرو۔ گلگلی۔ میری چندر مکھی۔

ہیروئن۔ پیارے! آؤ چلیں۔ یہاں سے کہیں دُور . . . . . دُور۔ جہاں آیوڈین کی بو نہ ہو۔ (گاتی ہے) کہیں دور . . . . ہائیں دُور . . . جہاں آیوڈین کی نہ ہو۔

دکھ بھنجن کمرے سے نکل کر سامنے ایک جنگل کی طرف گلگلی کو ساتھ لئے چل پڑتا ہے، غروبِ آفتاب کا سحرافروز نظارہ ہلکی ہلکی دلفریب پس منظر موسیقی۔ چلتے چلتے دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہیرو۔ گلگلی۔ تمہیں وہ دن یاد ہے، جب باغ میں . . . .
(گانے لگتا ہے)

ایک تھا دھوبی
ایک تھا دھوبی

گلگلی۔ (دلکش مسکراہٹ سے) ایک تھی دھوبن

ہیرو۔ ایک تھا دھوبی۔

ہیروئن ۔ (جھوم کر) ایک تھی دھوبن

ہیرو ۔ ایک تھا گھوسی ۔

ہیروئن ۔ (لپک کر) ایک تھی گھوسن ۔

ہیرو ۔ ایک تھا درزی ۔

ہیروئن ۔ (دلکش مسکراہٹ سے) ایک تھی درزن

سینما ہال میں تماشائی جھوم رہے ہیں ۔ کیا شاندار "ڈویٹ" ہے کمال کر دیا ۔ واللہ ۔

(دونوں گاتے گاتے آگے چل پڑتے ہیں ۔ ایک پیپل کے درخت تلے ایک سادھو کھڑا گا رہا ہے ۔)

پانی میں مچھلی	پانی میں مچھلی
مچھلی میں پانی	مچھلی میں پانی
دنیا ہے کیا	ایک باقرخانی

ہیرو اور ہیروئن گانا ختم ہونے تک سادھو کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں ۔ گانا ختم ہونے کے بعد آخری بار ہاتھ جوڑ کر آگے چل پڑتے ہیں ۔ سامنے پیپل کے درختوں کے جھنڈ میں سورج غروب ہونے کو ہے ۔ درختوں سے پرے سمندر کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے ۔

گلگلی ۔ (ہیرو کا بازو پکڑ کر) دکھ بھنجن ہم کدھر جا رہے ہیں ؟

دکھ بھنجن ۔ (بے خود سا ہو گیا) نہیں معلوم ۔

گلگلی ۔ (حیران نگاہوں سے) کیا وہ پیپل کا درخت ہے ؟

دکھ بھنجن۔ (اسی لہجہ میں) نہیں معلوم۔

گگ گلی۔ (ایک لمبے وقفہ کے بعد دھیمے لہجہ میں) کیا وہ سورج ہے؟

دکھ بھنجن۔ (اسی لہجہ میں) نہیں معلوم۔

(سورج غروب ہوجاتا ہے۔ پردہ سیمیں پر سیاہی آجاتی ہے۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔)

(سینما ہال سے باہر نکلتے ہوئے)

"کمال کر دیا نرنجن گھوسی نے کمال کر دیا"

"کتنے فطری مکالمے ہیں۔ کیسے خوبصورت گانے"

"کتنا نیچرل ایکٹنگ ہے۔ شاندار ڈائریکشن۔"

"یہ آرٹ ہے صاحب آرٹ"

(لوگ ادھر ادھر جاتے ہوئے گنگنا رہے ہیں)۔

"ایک ننھا طوطا ایک ننھی دھوبن

(جملہ حقوق محفوظ، کوئی صاحب فلم بند نہ کریں)

ہوائی قلعے

"ہوائی قلعے" کا موضوع وہی ہے۔ جو ہندوستانی میں "خیالی پلاؤ" کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "خیالی پلاؤ" ہندوستان کی مثالی "بھوک" کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے یہ ایک محدود سی اصطلاح ہے جس کا مرجع محض "پیٹ" ہے۔ لیکن "ہوائی قلعے" ایک بلند اور وسیع ترین اصطلاح ہے۔ اور اس میں نہ صرف خیالی پلاؤ بلکہ کئی ایک اور دلکش چیزیں بھی شامل ہیں کہ جن کے وجود سے ہندوستان ابھی تک نا آشنا ہے۔ ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے "خیالی پلاؤ" میں "ہوائی قلعے" نہیں سما سکتے۔ لیکن ہوائی قلعے میں بیٹھ کر "خیالی پلاؤ" پکائے جا سکتے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس لحاظ سے سارا ہندوستان ایک "ہوائی قلعہ" معلوم ہوتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی ہوائی قلعے بنائے ہیں؟ میں بچپن کی بات نہیں کرتا جب ساری زندگی ہی ایک ہوائی قلعہ معلوم ہوتی ہے، ماں کی گود میں جا بیٹھے اور پھر اونگھتے اونگھتے ایک دم پھر سے چڑیا بن کر باغ میں سیب کے سفید سفید پھولوں پہ جا بیٹھے اور وہاں سے

چونچ نکال کر ماں کو ڈرانے لگے، دیکھو، دیکھو، اماں ہیں کتنی اونچی جگہ پر جا بیٹھا ہوں!
اور اماں ہنس کر پڑوسن سے کہتی ہے "کس قدر بھولا ہے، نادان میری گود میں بیٹھا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بہت اونچی جگہ بیٹھا ہوں ——" اس کے بعد تمہیں پیار سے تھپک کر کہتی ہیں، "سو جاؤ میرے ننھے"،
—— اور تمہارا ہوائی قلعہ ٹوٹ جاتا ہے۔

بالیوں کر رینگتے رینگتے آنگن میں چلے گئے، دیوار کے ساتھ تین انیٹیں لگالیں، ایک تو ہے کالا کوا، وہ دیو سا جانور جو منڈیر پر بیٹھ کر اپنی خوفناک آوازیں چلایا کرتا ہے۔ اور جو کبھی کبھی تمہیں اکیلا پاکر تمہارے ننھے منے ہاتھوں سے بسکٹ چھین لیا کرتا ہے۔ دوسری اینٹ بے شک تمہاری بڑی بہن ہے جو تمہیں ہر وقت چومنے پر مصر رہتی ہے۔ جو تمہیں میٹھی بھی لگتی ہے۔ اور تلخ بھی، میٹھی اُس وقت جو منے پر جب کھلونے کھلاتے، ہنستے ہنساتے تمہیں ایک بارگی زور سے گلے سے لگالیتی ہے اور تمہیں عجیب عجیب، پیارے پیارے ناموں سے بلاتی ہے اور تلخ اُس وقت جب وہ تمہیں نہلانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتی ہے۔ یقیناً تمہیں پانی پسند نہیں، آخر تم ایک خشکی پر چلنے والے جانور ہو نہ کہ مچھلی، اور پھر وہ صابون کا نمکین جھاگ جو ناک کے نازک نتھنوں میں، آنکھ کے پپوٹوں کے اندر پہنچکر مرچیں سی لگا دیتا ہے! —— پھر کس سختی سے وہ ایک کھُردرا تولیہ لے کر تمہارے چھوٹے سے جسم کو صاف کرتی ہے حتیٰ کہ تمہارا سارا جسم لال ہو جاتا ہے۔ اور اس عمل کے دوران میں وہ برابر گنگناتے جاتی ہے کوئی بے معنی گیت۔ اور پھر کوئی تھوڑا سا خوشبودار تیل لے کر تمہارے چھوٹے

سے سر پر اس زور سے مالش کرتی ہے ۔ کہ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ ننانا سا سر ٹوٹ جائے گا ۔ مگر یہ بھی تم برداشت کر لیتے ہو ۔ لیکن وہ اس پر بھی بس نہیں کرتی ، بلکہ لکڑی کی ایک خانہ دار چپٹی سی رکھ دے کر وہ اُسے پیار پیارے تمہارے گھنگریالے بالوں میں پھیرتی ہے جتنے کہ درد کی شدت سے تم بلبلا اُٹھتے ہو اور حیران ہوتے ہو کہ وہ میری میٹھی بہن کہاں گئی ۔ اور یہ کون ہے جسے مجھے رُلانے میں مزہ آتا ہے ۔

تیسری اینٹ ۔ تمہارا سب سے بڑا بھائی ہے ، وہ تمہیں شاذ ہی دکھائی دیتا ہے اکثر اُس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب ہوتی ہے اور آنکھوں پر ایک چمکتی ہوئی عینک ، وہ تمہیں اُس وقت پیار کرتا ہے ۔ جب تم بالکل اکیلے ہوتے ہو ۔ پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھ لیتا ہے ۔ کہ تم بالکل اکیلے ہو نا اور پھر تم ابھی دل ہی دل میں حیران ہو رہے ہوتے ہو کہ یہ میرا اتنا اونچا بھائی کیا کر رہا ہے ۔ اور اسکی آنکھوں پر وہ گول گول سی چیزیں کیا چمک رہی ہیں کہ وہ تمہیں یکایک زمین سے اتنا اونچا اُٹھائے جاتا ہے ۔ گویا تم آسمان سے جا لگے ہو ۔ وہ تمہیں ہوا میں پھینک دیتا ہے بہت اوپر کہ تم یکایک ڈر جاتے ہو ۔ پھر وہ بانہیں پھیلا کر تمہیں جھٹ آغوش میں لے لیتا ہے ۔ کہ تم خوشی سے ہنسنے لگتے ہو تمہیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی ہنسنے لگ جاتا ہے ۔ وہ تمہیں گدگداتا ہے اور تم زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہو ۔ جس پر وہ تم سے بھی زیادہ زور سے قہقہے لگاتا ہے ۔ اس شور و غل کو سنکر گھر کے چار پانچ افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں ۔ خالہ ۔ اماں ،

باورچن، بڑی بہن اور اُس کی سہیلی، پھر وہ سب مل کر بڑے بھائی پر ہنستے ہیں۔ اور بڑا بھائی شرمندہ سا ہو کر تمہیں جھٹ زمین پر اتار دیتا ہے اور بھاگ کر اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔

اب ان تین اینٹوں ہی سے تم دن بھر کھیلتے ہو۔ تم بڑے بھائی کی عینک اتار لیتے ہو۔ اور اُسے ایک گائے بنا کر بہن کی چوٹی سے باندھ دیتے ہو۔ تم بڑی بہن کو صابون کے جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتے ہو۔ وہ چیختی ہے تم خوش ہوتے ہو اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو، آنگن میں ایک طرف، کونے میں بیٹھی ہوئی اماں تمہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہیں اور پھر تکلی پر سُوت چڑھا کر اُسے گھماتی ہیں۔ اتنے میں وہ پہلی اینٹ جسے تم گوا سمجھتے ہو، تمہارے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے جاتی ہے، اور تم غصہ میں آکر اُسے دیوار سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیتے ہو اور بسورنے لگ جاتے ہو۔

اور اماں پوچھتی ہیں "اوں اوں کرتے ہو۔ ابھی تو ہنس رہے تھے؟"

نہیں، نہیں، میں بچپن کے ہوائی قلعوں کی بات نہیں کرتا۔ میں تم سے لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کے ہوائی قلعوں کا حال پوچھتا ہوں۔ کیا لڑکپن کی شرارتوں میں بھی تم نے بچپن کے پرانے کھیل کا اعادہ کیا ہے؟ بچپن کی زندگی تو ایک مسلسل حیرانی کی زندگی تھی۔ ابا جان کے حقّے سے لے کر کونین کی پہلی پڑیا تک ہر چیز حسین نظر آتی تھی۔ تم ایک مٹی کی گڑیا میں جان ڈال

دیتے تھے، ایک لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر تمام دنیا کی سیر کر آتے تھے، ایک کاغذ کی ناؤ میں بیٹھ کر سات سمندر پار چلے جاتے تھے۔ لیکن کیا لڑکپن میں تم اپنے اُس پرانے محبوب کھیل کو بھول گئے تھے؟ سچ کہنا، تم نے اپنے شریر تخیل کی مدد سے کتنی بار سکول کی عمارت کو آگ لگائی ہے، حتیٰ کہ اُس کے شعلے آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔ کتنی بار اُس موٹے ٹھنگنے استاد کو کہ جو تمہیں تاریخ پڑھاتے وقت تمہارے بازوؤں میں زور زور کی چٹکیاں لیا کرتا ہے، ایک اونچے کھجور کے درخت کے ساتھ اس طرح اُلٹا لٹکا دیا کہ دنیا بھر کی کوئی کوشش اُسے نیچے اتارنے میں کامیاب نہیں ہوئی، اور پھر سکول کے سب اُستاد ہیڈ ماسٹر سمیت (اور یہاں تم مسکراتے ہو!) تمہارے پاؤں پڑتے ہیں، اور تم ایک دم اچھل کر اُس اونچی کھجور کی آخری پھننگ پر پہنچ جاتے ہو اور اپنے استاد کو چشم زدن میں نیچے اُتار لاتے ہو اور پھر وہ عمر بھر تم سے تاریخ کے سوال نہیں پوچھتا۔

یکایک تمہیں ہوش آجاتا ہے اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تم اسی موٹے ٹھنگنے تاریخ پڑھانے والے استاد کے عین سامنے بینچ پر جماعت میں بیٹھے ہو۔ اُس نے غالباً تم سے کوئی سوال پوچھا ہے مگر تم اُس کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہو، کیسے دے سکو گے۔ جب کہ تم ایک دل خوش کن ہوائی قلعہ بنانے میں مصروف ہو۔ کہ جس میں ایک کھجور کے درخت پر تم نے اسی استاد کو اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ تمہیں

تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے کیا سوال کیا ہے، تم لازماً خاموش رہ جاتے ہو؛

پھر وہ تمہارے بازوؤں میں چٹکیاں لیتا ہے!

یا پھر ورزش کے میدان میں کھیلتے کھیلتے تمہیں یکایک احساس ہوتا ہے کہ تم سکول کے سب سے اعلیٰ کھلاڑی بن گئے ہو، تم ہاکی کھیل رہے ہو اور مخالف ٹیم کو گول پہ گول کر رہے ہو۔ چاروں طرف شامیانے لگے ہیں اور لوگ تمہیں دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اب آدھا وقت ختم ہو چکا ہے، اور تمہیں چائے اور سنگترے، آڑو اور کیک پیش کئے جا رہے ہیں، تمہارا ہیڈ ماسٹر تمہیں شاباش کہتا ہے، یکایک سیٹی بجتی ہے اور اب تم ہاتھ میں کرکٹ کا ایک بلّا لئے جا رہے ہو اور وکٹ پر پہنچ کر خوب زور سے ہٹ (HIT) لگاتے ہو، وہ مارا، گیند آسمان کی طرف اُچھلتی ہوئی میدان کو پار کر جاتی ہے اور لکڑی کے اس بڑے سے تختے پر جو میدان کے باہر لگا ہے تمہارے نمبر کے آگے "چھ" کا ہندسہ لگ جاتا ہے اور تمہارے دوست حیران ہوتے ہیں، چھ! ارے ایک ہٹ (HIT) میں چھ! تو یہ لڑکا بھی ایک آفت ہے، ارے یہ تو چھپا رستم نکلا (اور یہاں تمہارے لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے) اور تم اس طرح ہٹ پر ہٹ لگاتے ہو کہ مخالف ٹیم میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور تم لڑکوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ——

ایں یہ کیا؟ یہ گیند کدھر چلی گئی؟ یہ شور و غل کیسا؟ یہ کپتان کیوں

پر خفا ہو رہا ہے، اور اب تمہیں شرمندگی سے احساس ہوتا ہے کہ جب تم گول پر کھڑے کھڑے اپنے تخیل کی زریں دنیا میں کھیل رہے تھے۔ یکا یک گیند تمہاری ٹانگوں کے نیچے بیچ میں سے گزر کر گول کو پار کر گئی۔

کیا تم سو رہے تھے؟ (کپتان تم سے خفا ہو کر پوچھتا ہے)

تم سر جھکا لیتے ہو اور یہ تمہارا ہوائی قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔

یا پھر یوں ہوتا ہے کہ تمہارا امتحان ہو چکا ہے۔ اور نتیجہ نکلنے والا ہے، اور تم اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہو اور یقین کر لیتے ہو کہ تم ہر مضمون میں اوّل ہو، نہ ہر مضمون ہی میں بلکہ ہر جماعت میں اوّل نکلتے ہو، آٹھویں سے نویں، نویں سے دسویں، ایف، اے، بی، اے ہر جماعت میں وظیفہ حاصل کرتے ہو۔ اُس کے بعد آئی، سی، ایس، یا اپنے شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس، وردی پہنے ہوئے، گھوڑے پر سوار، لوگ چاروں طرف سے سلام کر رہے ہیں اور تمہاری دستار کا سفید براق طرہ ہوا میں لہرا رہا ہے، گھر پہنچتے ہو تو بینڈ بجتا ہے، والد فرطِ مسرت سے گلے لگا لیتے ہیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا دبلا پتلا لڑکا جو تمہاری جماعت میں تم سے اوّل رہا کرتا تھا، اب تمہیں کیسی حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

مگر دوسرے دن جب نتیجہ نکلتا ہے تو تمہارے ہر ہم جماعت کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تم تو محض اپنے والد کے اثر و رسوخ سے پاس ہوئے ہو۔

آہ، میں تم سے جوانی کے ہوائی قلعوں کا حال کیونکر پوچھوں، میں پوچھتا ہوں وہ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں، سیپ کے موتیوں کی طرح کتنے نازک ہوتے ہیں

پانی کے شفاف بلبلوں کی طرح، کتنے پیارے ہوتے ہیں، مجذوب کی نگاہوں کی طرح، ان کی پینگیں تمہیں عرش کی بلندیوں پر لے جاتی ہیں اور دوسرے لمحہ میں زمین پر اُگی ہوئی حقیر گھاس کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ وہ دل میں سوئے ہوئے نغموں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ جذبات کے دبے ہوئے سوتوں کو اُبلتے ہوئے چشموں کی صورت میں بہا دیتے ہیں، اور لرزتی ہوئی ناکام حسرتوں کو بجلیاں بنا دیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم خار دار میدان میں اپنے بے ہوش محبوب کو اٹھائے ہوئے چل رہے ہو، ہر قدم پر ایک نیا کانٹا تمہارے پاؤں میں چبھ جاتا ہے اور ایک نیا گھاؤ پیدا کر دیتا ہے، مگر تم ہو کہ پروا نہیں کرتے، سامنے اک آگ کا دریا ہے، تم اس میں سے بھی گزر جاتے ہو تمہارے بال جھلس گئے ہیں، جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں، مگر تم اپنے محبوب کو اپنے دل میں چھپائے، صحیح و سلامت، صاف بچائے جاتے ہو، اب ٹھنڈی ہوا ہے۔ ایک خوشنما چمن ہے، پھولوں کی روشوں میں ایک مرمریں مسہری پر تم اپنے محبوب کو لٹا دیتے ہو، پھر تمہیں ایک سانپ ڈس لیتا ہے۔ محبوب کو ہوش آجاتا ہے اور تم اسے دیکھتے ہوئے مر جاتے ہو!

جوانی کے ہوائی قلعے کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ اور بچپن اور لڑکپن کے قلعوں سے کتنے مختلف کئی پُرانے ہوائی قلعے تھے کہ بچپن اور لڑکپن کے زرّیں عہدوں کی یادگار تھے مگر ناسازگاریٔ زمانہ سے جوانی میں آکر معدوم ہو گئے وہ بچپن کا ساتھی، گُلّی ڈنڈا کھیلنے والا ہمجولی، جس کے ساتھ بیٹھ کر اپنے مستقبل کے ہوائی قلعے تعمیر کئے تھے، وہ آج کہاں ہے؟

بچپن سے لڑکپن تک وہ ساتھ دیتا ہے - اب یکا یک عنفوانِ شباب میں کیوں
اس دنیا سے روٹھ گیا - اور یکا یک سارے قلعوں کو مسمار کر گیا - وہ الھڑ، انیلی
لڑکی جس سے بڑے چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ موٹ بیاہ رچایا تھا۔ کیوں
عین شباب کی سرمستیوں میں ایک بالکل انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن
کر چلی گئی - اور تمہارے کلیجے میں ناسور پیدا کر گئی، ہاں! جوانی میں آدمی بہت
سے پرانے ہوائی قلعوں کو ٹوٹتا دیکھتا ہے، اور ان کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ
اُس کے بچپنے کی معصومیت اور لڑکپن کی شوخی اور شرارت بھی رخصت ہوتی
جاتی ہے -

لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو بچشمِ پُرنم خیرباد کہی
وہاں تم نے بہت سے نئے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی، تم نے اپنی سانولی محبوبہ
کی رنگت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا - اپنی گرتی ہوئی پسماندہ
قوم کو یکا یک دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقت ور قوموں کے زمرے میں بٹھا دیا -
اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کر دیا کہ کائنات کی کل وسعتیں
اُس کے سائے تلے آگئیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک
جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا - اور اپنے کریکٹر کو اتنا
سنوارا کہ بنی نوع انسان نے متفقہ ووٹ سے تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم
کیا - تم دنیا کے سب سے بڑے شاعر، ادیب افسانہ نویس، سیاست داں
سپاہی، حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمہارے
سر پر رکھا گیا!

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اس وقت کھلی۔ جب تم ایک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے، ایک حقیر سے مشاہرے پہ ملازم ہوئے، تمہارے ماں باپ اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور تمہارے پلے ایک چڑچڑی اور بے حد وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبّت کے سوتے خشک ہو گئے، پھونس کے جھونپڑے جل گئے، اور تمہارے ملک و قوم غریب تر ہوتے گئے۔

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے، جوانی کے بعد پیری آئی، اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے، اپنے لئے کچھ باقی نہیں، اب توجہ دوسروں کی طرف ہے، بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لئے بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اپسرائیں ناچ رہی ہیں۔ اور اس کے خوبصورت داماد نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا اسپتال تعمیر کیا ہے۔ جس میں دنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دادا کو خود گنٹھیا کا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔

خدائے بزرگ نے ستّر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں، ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں، وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گنٹھیا کی وجہ سے نہیں ناچ سکتے۔ وہ گانا چاہتے ہیں۔ مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے۔ سننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے، پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، یا روشنی ہی روشنی، یا پانی ہی پانی، پھر انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ سمٹ رہے ہیں، سکڑتے ہوئے، سمٹتے ہوئے صرف ایک ذرہ بن کر رہ گئے ہیں، اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرّہ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن مد پانی کی پتلی سی لہر:

اسی طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے:۔

ہماری مطبوعات

آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۴۵
فصل گل آئی یا اجل آئی		۹
آتش گل	جگر مراد آبادی	۲۰
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۱۲
زیر لب	صفیہ اختر	۱۱
حرف آشنا	"	۹
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۹
پطرس کے خطوط	"	۱۰
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۹
زرد پتے	خلیل جبران	۶
پھول کی تنہائی	کرشن چندر	۱
الٹا درخت	"	۸
کرنیں	شفیق الرحمٰن	۱۲
گنجے فرشتے	سعادت حسن منٹو	۱۸
ٹھنڈا گوشت	"	۱۲
انارکلی	"	۱۰

مکتبہ اردو ادب
بار دستہاد
اندرون لوہاری گیٹ
لاہور